بنتِ حرام
اور دوسرے افسانے
منیرالدین احمد

بنت حرام

اور دوسرے افسانے

منیر الدین احمد

BINT -E- HARAM
(Strories)

By

Dr. Munir D. Ahmed
Deutsches Orient-Institut
Mittelweg 150
20148 Hamburg - Germany

Price Rs. 100/=

سرورق : چودھری رشید
قیمت : ۱۰۰ روپے
طباعت : عزیز پرنٹنگ پریس، نئی دہلی

اشاعتِ اول : کراچی ۱۹۹۹ء
اشاعتِ دوم : دہلی ۱۹۹۹ء

معیار پبلی کیشنز
کے۔۳۰۲/۲ تاج انکلیو، گیتا کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۱ (انڈیا)

فہرست

پیش لفظ

انسان کی زندگی ایک چیستان ہے ۔ کہانی اس چیستان کا بیان ہے ۔ آخر کہانیوں سے ہی آسمانی صحیفے بھرے پڑے ہیں ۔ خدا کی بھی کہانیاں ، خدا کی مخلوق کی بھی کہانیاں ۔ کہانی ہماری بڑی با اثر شے ہے ۔

کہانی کہنے کا بھی ایک سلیقہ اور فن ہوتا ہے ، جس کا خوبصورت جو کتھا بیانیہ کی صداقت اور آرائش سے بندھتا ہے ۔ کہانی میں کہے گئے واقعات اپنی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور کہانی ایک ڈرامائی پنچ کے ساتھ ختم ہو جائے ، تو پڑھنے والے اور بیان کرنے والے دونوں کو لطف آتا ہے ۔

رسالہ " نقوش " میں میں نے منیر الدین احمد کی لکھی ہوئی کہانیاں پڑھیں تو جی چاہا کہ معلوم کیا جائے یہ کہانی کار جرمنی میں کیا کرتا ہے ۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ان سے خط و کتابت ہونے لگی اور آج میں ایک حوصلہ افزا. مسرت اور گرمی نشاط سے ان کی کتاب کا پیش لفظ لکھ رہا ہوں ۔

یوں تو اصناف ادب میں کوئی بھی ہوں ، افسانہ ، ناول ، وقائع نگاری ، تذکرہ نویسی ، خود نوشت ، سبھی میں بات کو بڑی مہارت سے آگے بڑھانا پڑتا ہے ۔ اس سارے عمل میں فنی اور جذباتی قرینے کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ بیانیہ میں جو واقعات شامل ہوتے ہیں ، وہ اپنی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور یہی واقعات تو افسانہ کی تکمیل آرائش کو سامان وجود مہیا کرتے ہیں ۔

یہ سارا تکنیکی عمل بڑے سلیقے کا متقاضی تو ہوتا ہی ہے ، مگر لکھنے والے پر مزید مشکل اس وقت آن پڑتی ہے ، جب کسی کردار کو بیانئے میں لانا پڑتا ہے ۔ اس

کردار کی صرف گفتگو اور مکالموں سے اس کے اندر باہر کا اظہار کرنا پڑتا ہے ۔ وہ کردار جب کسی مشکل میں مبتلا ہو ، تو اس کے جذبات دروں کا اظہار مزید مشکل بن جاتی ہے ۔ اس لئے افسانہ ایک مشکل فن قرار دیا گیا ہے ۔

افسانے میں صرف وہ کونے کھدرے ، وہ پہلو سامنے لائے جائیں ، جن کی بنت از بس ضروری ہو ۔ جس کے بغیر چارہ نہ ہو ۔ افسانے میں فضول ، فالتو ، غیر ضروری بات کا ذکر نہ ہونے پائے ۔ یوں کہہ لیجیئے صرف وہ صفات سامنے لائی جائیں ، جن پر اس کردار کو انحصار کرنا ہے ۔ صرف وہ جو اس کا محور بنیں گی ۔

افسانے میں رونق اس وقت پیدا ہوتی ہے ، جب لکھنے والا منطقی اور فنی ضرورت کے مطابق خود کو بھی اور اپنے قاری کو بھی ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے ۔ یہ رشتہ لکھنے والے کا اور پڑھنے والے کا بڑا اہم رشتہ ہوتا ہے ۔ دونوں ایک پنڈولے میں ہوتے ہیں ، جو خلوص فن کا ہوتا ہے ۔ قاری ایسا ذہین ہوتا ہے کہ اگر پنڈولہ جھوک کھائے ، تو قاری کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ جھوک کھا رہا ہے ۔ قاری کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا ۔ وہ ہمیشہ سے ذہین رہا ہے ۔ فوراً انگلی رکھ دیتا ہے کہ لو یہاں خرابی ہے ۔

کہانی کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کی توجہ ابتدائی دس پندرہ سطور میں ہی جذب کر لے ۔ کہانی کو ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہ چاہے ۔ کہیں جھول نہ پڑنے پائے ۔ کہیں کہانی کی چولیں ڈھیلی نہ ہوں ۔ جذباتی منطق ٹھیک ٹھاک رہے ۔ مکالے ایسے بامعنیٰ اور مختصر کہ بات کی تفصیل کی دلیل بنیں اور بین السطور ایسی کہ چھپی ہوئی بے تفصیل بات کو تفصیل ملے ۔ اندر سے آواز آئے : " اچھا یہ بات تھی " ۔ واہ کیا کہانی کہہ گئے ۔ کہانی کہنے والا کتنا سمارٹ تھا ۔ چلو اگلی کہانی پڑھیں ۔

ان اصولوں ، ضرورتوں اور سختیوں کے سبب سے کہانی لکھنے کے فن کو مشکل فن قرار دیا گیا ہے ۔ اسی لئے تو کہانی کار بہت کم ہوتے ہیں ۔ ہر کوئی کہانی نہیں کہہ سکتا ۔ فکشن لکھنا کارے دارد ہے ۔

اس کتاب میں بارہ کہانیاں ہیں ۔ ایک سے ایک بہتر ۔ آپ خود اندازہ لگا

لیں کہ منیر الدین احمد کے فن نے ترقی کی کتنی منازل کو طے کر لیا ہے ۔ کہانی کا بیانیہ ، کہانی کی تہ داری ، کرداروں کی ساخت پرداخت ، واقعات کا اظہار و بیان ، کہانی کے عروج کا مقام ، مستزاد ڈرامائیت کا نچ ، ڈرامائیت کی اپنی نہج اور سطح کہانی میں کیا ستارہ بندی کرتی چلی جا رہی ہے ۔ افسانوں میں زندگی کی ناکامیاں اور کامیابیاں ہوتی ہیں ۔ نفس انسانی کی گہرائیوں کے ہر کاب ناہمواریاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں ۔ دکھ سکھ کی حکایتیں ہوتی ہیں ۔ زندگی اپنے ہزار رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ کتنی مزے کی بات ہے کہ ہر کہانی میں منیر الدین احمد کا مشاہدہ کہانی کے حرف و بیان کا رکاب دار بنتا چلا جاتا ہے ۔ مجھے از بس خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ منیر الدین احمد کی یہ کہانیاں چیستان حیات کے نوع بہ نوع رنگوں سے مزین ہیں ۔

اہل مغرب کی کہانیاں اردو میں پڑھنے کو بہت کم ملیں گی ۔ منیر الدین احمد نے یہ خوانچہ ، جو خالی پڑا تھا ، خالی نہیں رہنے دیا ۔ اس لحاظ سے انہوں نے اس خالی خوانچے کو دلچسپ کہانیوں سے بھر دیا ہے ۔ یہ کام بجائے خود بہت بڑا کام ہے ، جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

آغا بابر

۱۳ جولائی ۱۹۹۷ء

ٹیری ٹاؤن

نیویارک (امریکہ)

خزانہ

کھانسی مجھے کئی روز سے آ رہی تھی اور بہت پریشان کر رہی تھی ۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سبب کیا ہے ۔ یوں بھی کھانسی کچھ عجیب قسم کی تھی، جس کا مجھے اس سے قبل کبھی تجربہ نہ ہوا تھا ۔ پھر کھانستے ہوئے مجھے پھیپھڑوں میں درد ہونے لگا ۔ سانس لیتے ہوئے بھی دقت ہونے لگی ۔ جب میں ایک شام سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو درد اس قدر بڑھ گیا کہ ڈاکٹر کو فون کرنا پڑا ۔ اس نے کہا کہ اگر آپ کار چلا سکتے ہیں، تو میرے مطب میں آجائیں ۔ چیک اپ کے بعد اس نے کہا کہ نمونیہ کے آثار لگتے ہیں ۔ اس نے ٹیکہ لگایا اور دوائیں دے کر گھر واپس بھیج دیا ۔ اس نے کہا کہ اگر درد کی شدت میں کمی نہ آئے، تو مجھ سے رابطہ کریں ۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد میری حالت اس قدر بگڑ گئی کہ اوتا نے ڈاکٹر کو خود آنے کے لئے کہا ۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑے گا ۔ اس کو خطرہ تھا کہ نمونیہ کا باعث شاید خون کا کوئی لوتھڑا تھا، جو رگوں میں چلتا ہوا پھیپھڑے تک پہنچ گیا تھا ۔ اس چیز کا امکان پایا جاتا تھا، کیونکہ میں نے چار ہفتے قبل دونوں ٹانگوں کی ایک ایک رگ کٹوا دی تھی، جن میں خون جمع ہونے لگا تھا ۔ متعلقہ رگ کٹنے کے بعد اس کا کام دوسری رگیں کرنے لگتی ہیں اور عام طور سے کسی پیچیدگی کے بغیر انسان نارمل زندگی گذار سکتا ہے ۔ مگر خون کا لوتھڑا رگوں میں چل نکلے اور دل سے ہوتا ہوا پھیپھڑے تک پہنچ جائے، تو جان کے جانے کا خطرہ ہوتا ہے ۔

ہسپتال کی ایمبولنس دس بارہ منٹوں کے اندر پہنچ گئی اور مجھے ہسپتال لے گئی ۔ ٹسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے کہ خون کا لوتھڑا پھیپھڑے تک پہنچ گیا

تھا اور میں خطرناک ایمبولی کا شکار تھا۔ خون کے دوسرے یا تیسرے لوتھڑے کو حرکت سے روکنے کے لئے ضروری تھا کہ میں سارا وقت لیٹا رہوں اور ایک قدم بھی اٹھ کر نہ چلوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ایمبولی کا علاج فوری طور پر ہونا چاہیئے، جب کہ نمونیہ سے بعد میں نمٹا جا سکتا ہے۔ درد کی شدت کو دبانے کے لئے مجھے دوائیں دی گئیں تاکہ میں رات کو آرام کر سکوں۔ مگر اگلی صبح میرا خیال تھا کہ ساری رات میں نے جاگ کر گذاری تھی۔

جس کمرے میں مجھے جگہ ملی تھی، اس میں چار مریض پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے دو بہت حد تک صحت یاب ہو چکے تھے اور چند روز میں ہسپتال کو چھوڑ کر جانے والے تھے۔ تیسرا مریض میری طرح بستر سے لگا ہوا تھا۔ وہ چلنے پھرنے سے لاچار تھا۔ چوتھا جس کا نام یُرگن تھا، قدرے جوان اور ہمارے مقابلے میں کم عمر تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے بدن کا سارا خون نچڑ گیا ہے۔ اس کا رنگ بستر کی چادر کی طرح سپید تھا۔ چاروں کے ساتھ میرا تعارف اگلی صبح ہوا۔ اس وقت تک درد کی شدت کم ہو گئی تھی اور میں اس قابل ہو گیا تھا کہ گفتگو میں تھوڑا بہت حصہ لے سکوں۔ پتہ چلا کہ چاروں خاصے زندہ دل تھے اور ایک دوسرے کو لطیفے سناتے اور خوب قہقہہ لگا کر ہنستے تھے۔ میں بھی آہستہ آہستہ ان کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا اور تھوڑا بہت ہنسنے بھی لگا۔ البتہ میرا بیمار پھیپھڑا مجھے قہقہہ لگانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ دوپہر کے کھانے تک کمرے کے پانچوں باسیوں میں ایک ایسی دوستانہ فضا قائم ہو چکی تھی کہ جب ڈاکٹر نے اپنے دورے کے دوران مجھے سنگل روم میں منتقل ہو جانے کی پیش کش کی، تو میں نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میرے ہم کمرہ ساتھیوں کا سلوک میرے ساتھ اتنا دوستانہ تھا کہ میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔

یہ ۲۴ دسمبر کی بات ہے، جس کی شام کو جرمنی میں کرسمس کے تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں۔ ہسپتال کا بیشتر عملہ کرسمس منانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو جا چکا تھا۔ مریضوں میں سے بھی جس کا جی چاہے چھٹی لے کر اپنے عزیزوں کے ہاں جا سکتا تھا۔ آئندہ چار روز تک ہسپتال میں علاج معالجہ یوں بھی موقوف تھا۔ ان دنوں میں مریضوں کی دیکھ بھال ضرور کی جاتی ہے، مگر بس اس حد تک کہ مرض نہ بڑھنے

پائے ۔ میں اور فریڈریش تو خیر چلنے پھرنے سے معذور تھے ، پتہ نہیں لوتھر اور ہائنز کیوں اپنے گھروں کو نہ گئے تھے ۔ یُرگن کی بیوی گیرڈا سہ پہر کو اس کے لئے کرسمس کے تحفے لے کر آ گئی ۔ وہ عمر میں یُرگن سے کم و بیش دس بارہ برس چھوٹی تھی ۔ اس کی نیلی آنکھیں قیامت ڈھا رہی تھیں ۔ وہ تو ساری شام وہیں پر گذارنا چاہتی تھی ، مگر یُرگن کا اصرار تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جائے ، جو یقیناً اس کا انتظار کر رہے ہوں گے ۔ اس کے جانے کے بعد یُرگن نے اپنی دوست مارٹینا کو فون کیا اور کہا کہ بلا ٹل گئی ہے ۔ اب تم آ سکتی ہو ۔ آدھ پون گھنٹے میں مارٹینا پہنچ گئی ۔ وہ یُرگن کی بیوی سے عمر میں کہیں چھوٹی تھی اور خوب چاک و چوبند تھی ، مگر خوبصورتی میں اس کی ہم پلہ نہ تھی ۔ وہ جتنی تیزی سے آئی تھی ، اتنی ہی پھرتی سے واپس چلی گئی ۔ اس کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ جا کر کرسمس منانی تھی ۔

مارٹینا کے جانے کے بعد کسی نے کہا کہ یہ کیسی غمگین کرسمس ہے ۔ اس پر فریڈریش نے کہا کہ اس نے اپنی زندگی کی غمگین ترین کرسمس دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اسٹالن گراڈ کے محاصرے کے دوران منائی تھی ۔ انہیں میدان جنگ میں پڑے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے اور دونوں طرف ہزاروں انسان مارے جا چکے تھے ۔ جرمن فوج میں ہر کوئی جانتا تھا کہ اسٹالن گراڈ پر فتح حاصل کرنا ناممکن تھا ۔ مگر ہٹلر کسی قیمت پر شہر کا محاصرہ اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا ۔ اسے پتہ تھا کہ اگر فوج کو وہاں سے پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا گیا ، تو پھر روس کا محاذ تاش کے پتوں سے بنائے ہوئے قلعہ کی طرح ڈھے جائے گا ۔ فریڈریش نے بتایا کہ اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی اور اس کے سر میں اپنی زندگی کے بارے میں بے شمار پلاننگ تھی ۔ گاؤں میں اس کی دوست موجود تھی ، جس نے اس کی واپسی تک انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ اس شام وہ اڑ کی اپنی ڈگمار کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا ۔ مگر وہ دن دیکھنا اس کے نصیب میں نہ تھا کہ وہ ڈگمار کو اپنے کلاوے میں لے کر چومتا ۔ جنگ کے خاتمہ پر اسے جنگی قیدی بنا کر روسیوں نے سائبیریا بھیج دیا ، جہاں پر اسے پندرہ برسوں تک کوئلے کی کان میں مشقت کرنی پڑی ۔ وہ تو کسی نہ کسی طرح اس جہنم سے زندہ واپس لوٹا تھا ، مگر ہزاروں دوسرے جنگی قیدی بیماریوں کا شکار ہو کر یا مشقت کی

سختی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

"ڈگمار کا کیا بنا"۔ میں نے پوچھا۔

"اس کا کیا بننا تھا"۔ فریڈریش نے کہا۔ "میں نے واپس آکر سنا کہ اس نے ساتھ کے گاؤں میں ایک کسان سے شادی کر لی تھی، جو جنگ کے تھوڑا عرصہ بعد امریکیوں کے جنگی قدیوں کے کیمپ سے بھاگ کر گھر لوٹ آیا تھا"۔

میں نے دل میں سوچا کہ فریڈریش کو کوئی دوسری ڈگمار مل گئی ہو گی۔ اس زمانے میں جوان عورتوں کی جرمنی میں بھرمار تھی۔ اس وجہ سے بیشتر مرد بیک وقت بہت سی عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے۔ عورتیں انہیں آسانی کے ساتھ بلا دام مل جاتی تھیں۔ اس لئے کچھ عجب نہ تھا کہ فریڈریش نے بھی ڈگمار کو بھلا کر دوسری عورتوں کے ساتھ اپنا دل بہلایا ہو گا۔

لوتھر نے کہا کہ اس کی کہانی بالکل مختلف ہے۔ وہ جنگ چھڑنے کے پہلے دن سے لے کر اس کے خاتمہ تک فوج میں تھا اور اٹلی اور فرانس کے محاذوں پر لڑتا رہا تھا اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ ایک بار بھی زخمی نہ ہوا۔ اس کو جنگ کے خاتمہ پر جنگی قیدی بھی نہ بننا پڑا۔ جب جنگ ختم ہوئی، تو وہ ایلزاز کے علاقہ میں تھا۔ وہاں پر اس نے قیدیوں کے کیمپ کمانڈر کو اپنی خدمات مائنز کی صفائی کے لئے پیش کر دیں چنانچہ اس کو دس قیدیوں کے دستے کا انچارج بنا دیا گیا اور وہ چھ ماہ تک اس کام میں لگے رہے۔ اس کے خاتمے پر کیمپ کمانڈر نے ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس کا وطن کہاں پر ہے۔ وہ مشرقی پروشیا کا رہنے والا تھا، جو اس دوران میں روسیوں کے قبضہ میں آنے کے بعد پولینڈ کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ اس کو بالکل پتہ نہ تھا کہ اس کے ماں باپ زندہ تھے یا نہیں۔ اور اگر زندہ تھے، تو انہیں کہاں پر سر چھپانے کو جگہ ملی تھی۔ البتہ اس کے پاس پریزڈورف کی ایک لڑکی کا پتہ تھا، جس کے ساتھ اس کی خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ دراصل وہ لڑکی اس کے ایک فوجی کامریڈ کی دوست تھی، جس کے پاس اس کی ایک تصویر بھی تھی۔ اس کو لڑکی کے خط باقاعدگی کے ساتھ آتے تھے۔ وہ ہر وقت لڑکی کی تصویر اور اس کے خطوں کو اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ اور جب اس کو گھر کی یاد آتی تھی، تو

وہ خطوں کو نکال کر پڑھا کرتا تھا۔ ایک روز دونوں مورچے میں تھے، جب ایک بم مورچے کے پہلو میں پھٹا اور اس کے ساتھی کے پرخچے اڑ گئے۔ لوتھر نے اس کی جیب سے لڑکی کی تصویر اور اس کے خط نکال کر محفوظ کر لیے۔ چند دنوں کے بعد جب وہ بیس کیمپ میں پہنچا، تو اس نے فوجی احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لڑکی کو اپنے ساتھی کی موت کی اطلاع دی اور ساتھ ہی لکھا کہ اگر اسے ناگوار نہ گذرے، تو وہ اس کے ساتھ خط و کتابت کرنی چاہتا ہے۔ جب اس کو گھر واپس جانے کی اجازت ملی، تو وہ سیدھا پہنڈورف اس لڑکی کے گھر پر پہنچا، جہاں پر اس کا استقبال کسی بچھڑے ہوئے بیٹے کی طرح کیا گیا۔ ان کی شادی پر پینتالیس سال ہو چکے تھے۔ میں نے اسی صبح اس کی بیوی کو دیکھا تھا، جب وہ لوتھر کو دیکھنے کے لئے ہسپتال میں آئی تھی۔

ہائیزان دونوں سے عمر میں چھوٹا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ہٹلر کے آخری ہلے کا حصہ تھا، جب چودہ اور پندرہ برس کے چھوکروں کو جنگ کے آخری دنوں میں محاذ پر جھونک دیا گیا تھا۔ ان کو صرف تین چار ہفتوں کی ٹریننگ کے بعد رومانیہ بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں پر پہنچنے کے تیسرے روز لام بندی ہو گئی اور اس کی کمپنی روسی فوج کی قید میں آئی۔ ایک روسی افسر کو اس کی کم عمری پر ترس آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں تم کو قیدی نہیں بنانا چاہتا۔ تم چپکے سے چلے جاؤ اور جرمنی واپس پہنچنے کی کوشش کرو۔ اس وقت وہ رومانیہ کے علاقہ زیبن برگن میں تھے، جہاں پر جرمن آباد ہیں، جو دو تین سو برسوں سے وہاں پر رہ رہے ہیں اور آپس میں بدستور جرمن بولتے ہیں۔ ایک عورت نے، جس کا بیٹا جنگ سے واپس نہیں لوٹا تھا، اس کو اپنے گھر میں کچھ دنوں تک رکھا اور اس کو اپنے بیٹے کے کپڑے پہننے کو دیئے، کیوں کہ وہ اس وقت تک جرمن فوج کی وردی میں تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے لئے کھلے بندوں دو قدم چلنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ عورت نے اسے کچھ سامان خورد و نوش دے کر جرمنی جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ راستے میں اس کو ایک مفرور جرمن فوجی مل گیا، جو اس کی طرح چھپ چھپا کر وطن واپس پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں کو دو ماہ تک چلنا پڑا تھا۔ راستے میں ان کو بعض اوقات کسان اپنے گڈوں پر بٹھا لیتے تھے اور

کھانے کو بھی دیتے تھے ۔ وہ دن کا وقت اکثر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں گذارتے تھے اور راتوں کو چلتے تھے ۔ اس طرح وہ بچ بچا کر جرمنی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ۔ مگر وہاں پر آبادیاں دشمن کی بمباری کے سبب برباد ہو چکی تھیں ۔ ہر طرف بے روزگاری کا دور دورہ تھا ۔ لوگوں کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ تھا ۔ جس کا داؤ چلتا تھا وہ چوری چھپے کچھ سامان حاصل کر کے بلیک مارکیٹ میں بیچتا تھا ۔ چونکہ کسی کے پاس نقد رقم نہ تھی ، اس لئے اکثر جنس کا تبادلہ جنس سے ہوتا تھا ۔ سگریٹوں کے بدلے میں آلو یا جوتوں کی جوڑی کے عوض پتلون یا کوٹ ۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ لوگ تبادلہ میں ملنے والی چیزوں کو آگے دوسری چیزوں کے بدلے میں دے دیتے تھے ۔

لوتھر نے کہا کہ اس کی ساس اور سسر زمیندار تھے ، اس لئے ان کو کھانے پینے کے سامان کی کمی نہ تھی ۔ فریڈریش چونکہ اس زمانہ میں جنگی قید میں تھا ، اس لئے اس کا ان چیزوں سے واسطہ نہ پڑا تھا ۔ جب وہ پندرہ سال کی قید کاٹ کر جرمنی واپس لوٹا ، تو ملک میں خوش حالی کے آثار نظر آتے تھے ۔ مگر اس کا اپنا مستقبل تاریک تھا اس نے اپنی زندگی میں سوائے بندوق چلانے اور کوئلے کی کان میں مشقت کرنے کے کچھ نہ سیکھا تھا ۔ اس لئے وہ موقع ملتے ہی فرانسیسی فارن لیجن میں بھرتی ہو کر جرمنی سے چلا گیا تھا ۔ اگلے دس برسوں تک وہ الجیریا ، کمبوچیا اور ویتنام میں فرانس کی لڑائیاں لڑتا رہا ۔

یُرگن جنگ کے آخری دنوں میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کا باپ جنگ سے واپس نہ لوٹا تھا ۔ اس کی ماں کو یہ خبر پہنچی تھی کہ وہ جنگی قید میں ہے ۔ مگر ماں کے نام کبھی وہاں سے کوئی خط نہ آیا ۔ یُرگن کا بچپن اپنے باپ کی راہ تکتے ہوئے گذرا تھا ۔ اس کو یقین تھا کہ ایک روز وہ اسکول سے گھر لوٹے گا ، تو اس کا باپ آیا ہوا ہوگا ۔ ہر روز وہ اس امید کو لئے ہوئے گھر آتا تھا اور باپ کو گھر پر موجود نہ پا کر بہت مایوس ہوتا تھا ۔ اس نے اپنی ماں کو یہ بات کبھی نہ بتائی تھی ۔ پھر بھی اس کی ماں کو پتہ تھا کہ اسے باپ کا انتظار تھا ۔ یُرگن نے کہا کہ وہ بدستور باپ کی راہ تک رہا ہے ۔ اس کی ماں نے کئی مردوں کے ساتھ دوستی لگائی ، جو اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے ، مگر اس

نے یُرگن کے احساسات کا پاس کرتے ہوئے کسی سے بیاہ نہ رچایا۔ یُرگن ان میں سے کسی کو اپنے باپ کی جگہ پر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

یُرگن نے جنگ نہیں دیکھی تھی، مگر جنگ کے بعد کا زمانہ اسے خوب یاد تھا۔ اس کے نانا کا مکان بمباری کی نذر ہو گیا تھا، جس میں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ بعد میں انہیں رہنے کے لئے جو فلیٹ ملا، اس میں تین خاندان مقیم تھے۔ ہر خاندان کے پاس ایک ایک کمرہ تھا۔ باورچی خانہ اور باتھ روم سب کا سانجھا تھا۔ ہفتے کے ہفتے مشترکہ حصے کی صفائی کی ڈیوٹی بدلتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ اس کام میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ پھر جب وہ تھوڑا سمجھ دار ہو گیا اور اسکول کی پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، تو اسے ایک دوکان کی طرف سے اخباروں کی تقسیم کا کام مل گیا تھا۔ اس طرح اس کو جیب خرچ کے لئے کچھ پیسے ملنے لگے۔ اس کی ماں کو اس کے لئے پہننے کے کپڑے پیدا کرنے کی فکر کھاتی رہتی تھی۔ بچے اس عمر میں اتنی تیزی سے قد کاٹھ میں بڑھتے ہیں کہ پلک جھپکنے میں ان کے کپڑے تنگ اور جوتے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ماں کو چرچ کی طرف سے کپڑے ملا کرتے تھے۔ جب ماں کو ایک دوکان میں ملازمت مل گئی، تو اس نے پہلی بار یُرگن کے لئے ایک کوٹ خریدا تھا اور اس پر بے حد فخر مند تھی۔

اسکول کے خاتمے پر اس کو ایک بنک میں اپرنٹس شپ مل گئی۔ تب سے وہ بنک میں ملازمت کر رہا تھا اور ترقی کرتے کرتے برانچ آفس مینجر بن گیا تھا۔

فریڈریش نے کہا کہ اب پتہ چلا کہ تمہیں یہ بے شمار لڑکیاں کہاں سے ملتی ہیں، جن کے روز فون آتے ہیں۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ایک روز اس ڈون خوان کو دیکھنے کے لئے تین چار پریاں یہاں پر بھی آن نکلی تھیں۔ مگر اس نے انہیں بیٹھنے نہیں دیا اور جلدی سے بھگا دیا، کیونکہ یہ اپنی بیوی گیرڈا سے بہت ڈرتا ہے۔ ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ گیرڈا آن پہنچی۔

گیرڈا اس روز یُرگن کی ڈاک ساتھ لائی تھی، جس میں ماڈل کاروں کا ایک کیٹالاگ شامل تھا۔ یُرگن اس کے مطالعہ میں ایسا منہمک ہوا کہ وہ اپنی بیوی اور ہم سب کو بھول گیا۔ گیرڈا نے کہا کہ اب اس کا وہاں پر بیٹھنا فضول ہے، کیونکہ جب

تک یرُگن آخری صفحے تک ساری ماڈل کاروں کو نہیں دیکھ لیتا، اس کے ساتھ بات نہیں کی جا سکتی۔ اور سچ مچ میں نے دیکھا کہ یرُگن ایک ایک کار کے بنائے جانے کا سن اور دوسری تفصیلات اس قدر دلچسپی سے پڑھ رہا تھا، جیسے انہیں حفظ کر رہا ہو۔ ایک کار کی تصویر کو دیکھ کر وہ قریب قریب اپنے بستر سے اچھل پڑا۔ وہ ماڈل اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔ اس نے مجھے وہ تصویر دکھائی اور میں پہلی نظر میں جان گیا کہ وہ بیوک کار تھی، جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بنائی گئی تھی۔ ایک ایسی کار تقسیم ملک کے زمانہ میں ہمارے ایک ہمسایہ کے پاس ہوا کرتی تھی۔ جسے اس نے کسی وطن لوٹنے والے انگریز سے سستے داموں میں خریدا تھا۔ وہ ہمارے محلے کی واحد کار تھی۔ اس کے ساتھ ایک مدراسی ڈرائیور بھی آیا تھا، جس کا نام سلیمان تھا۔ وہ اتنا اچھا مکینک تھا کہ کار کے ایک ایک پرزے کو کھول کر اس کی مرمت کر لیتا تھا۔ سالوں تک وہ کار ہمارے مکان کے باہر سڑک کی زینت بنی رہی تھی۔ بعض اوقات جب سلیمان موڈ میں ہوتا تھا اور کار کا مالک کہیں باہر گیا ہوا ہوتا تھا، تو وہ محلے کے بچوں کو سیر کرانے کے لئے لے جاتا تھا۔

گیرڈا کے جانے کے بعد یرُگن آدھی رات تک مجھے اپنی ماڈل کاروں کے بارہ میں بتاتا رہا کہ اس نے کونسی ماڈل کار کہاں سے کس قیمت پر خریدی تھی۔ چونکہ اکثر نمائشیں ویک اینڈ پہ لگتی ہیں، اس لئے وہ سال میں بیس پچیس ویک اینڈ سفر میں گذارتا تھا۔ ماڈل کاروں کے کیٹالاگ مختلف کمپنیوں کی طرف سے چھاپے جاتے ہیں، جن میں وہ خود بھی اشتہار دیا کرتا تھا۔ مگر کبھی اپنا پتہ نہیں چھپواتا تھا۔ کیونکہ انشورنس کمپنی کی طرف سے اس امر کی سخت ممانعت تھی۔ اس کے مکان کا پورا بیسمنٹ کسی میوزیم کی طرح ماڈل کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو ماہوار کئی سو مارک انشورنس پریمیم ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی کولیکشن کی قیمت ڈیڑھ ملین مارک کے لگ بھگ تھی۔ اس وجہ سے اس نے مکان کے دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں پر خاص قسم کا شیشہ لگوایا تھا، جسے توڑا نہیں جا سکتا۔ اس کے گھر کا آلارم سسٹم ایسا تھا کہ گھنٹی پولیس اسٹیشن پر بجتی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اجنبیوں کو داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ البتہ میں کسی روز اس کو ملنے کے لئے آیا، تو وہ مجھے اپنی

کولیکشن ضرور دکھائے گا۔

میں نے اسے اپنی پہلی کار کے بارے میں بتایا، جب میں نے سیکنڈ ہینڈ خریدا تھا۔ وہ چلتے چلتے راستے میں روٹھ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور پھر دھکا لگانے سے چلتی تھی۔ میں نے ایک بار اس میں ایک لمبا سفر کرنا چاہا۔ تین سو کلو میٹر پر جا کر ٹائر بدلنا پڑا۔ پھر فرانکفورٹ پہنچتے پہنچتے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی اور مجھے باقی کا سفر ریل گاڑی سے کرنا پڑا۔ جب میں نے واپسی پر اسے فرانکفورٹ کے ایک گیراج سے مرمت کے بعد خاصی بڑی رقم ادا کر کے وصول کیا، تو بمشکل ایک سو کلو میٹر چل کر اس کا انجن جواب دے گیا اور مجھے اپنی جیب میں سے پیسے دے کر اس سے جان چھڑانی پڑی۔

ہمارے کمرے کو گفتگو کے لئے موضوع مل گیا اور ہم آئندہ دنوں میں اپنی کاروں کی کہانیاں سنانے لگے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آدمی اس موضوع پر دنوں اور ہفتوں تک بات کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا سلسلہ میرے صحت یاب ہو کر ہسپتال سے فارغ ہونے تک چلتا رہا۔ لوتھر اور ہائینز مجھ سے پہلے جا چکے تھے۔ میرے جانے کے بعد فریڈریش اور یُرگن کمرے میں باقی رہ گئے۔

میں ہسپتال سے فارغ ہو کر آیا، تو بے شمار کام میری راہ تک رہے تھے۔ میں ان میں ایسا مصروف ہوا کہ ہسپتال کے ساتھیوں کو بالکل ذہن سے اتار بیٹھا۔ جب انسان مصروف ہو، تو دن گذرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ پورے ایک سال کے بعد مجھے یُرگن کی یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر تم کبھی میرے گھر پر آئے، تو میں تمہیں اپنی ماڈل کاروں کی کولیکشن دکھاؤں گا۔

اس کے گھر کی تلاش میری توقع سے بڑھ کر آسان نکلی۔ گھنٹی بجانے پر گیرڈا نے دروازہ کھولا اور مجھے سامنے پا کر اس نے خوشی کے مارے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اس نے کہا کہ میں ایک سال کی تاخیر سے آیا تھا۔ یُرگن میرے ہسپتال سے جانے کے ایک ماہ بعد اندرونی طور پر خون جاری ہو جانے کے سبب، جس کو روکا نہ جا سکا، مر گیا تھا۔ وہ مجھے دیوان خانے میں لے گئی، جس کی ڈیکوریشن اوسط درجے کے جرمن گھرانوں جیسی تھی۔ ضرورت سے بڑا صوفہ اور بھاری بھر کم کرسیاں، الماریاں سامان آرائش سے لدی پھندی ہوئی۔ مگر مجھے ایک بھی ماڈل کار نظر نہ آئی۔

"یُرگن کی ماڈل کاروں کا کیا بنا" - میں نے پوچھا۔

"ان کا کیا بننا تھا" گیرڈا نے کہا۔ "وہ ساری کی ساری اس کمرے میں محفوظ ہیں" - اس نے کہا اور الماری میں سے تین البم اٹھا لائی۔

"یہ ہے یُرگن کی کولیکشن، جس پر اس کو اتنا ناز تھا"۔

میں نے ماڈل کاروں کی تصویریں دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو تصویریں ہوئیں۔ اصل ماڈل کاریں کہاں پر ہیں"۔

"کونسی اصل ماڈل کاریں" گیرڈا نے پوچھا۔ "یُرگن کے پاس ایک بھی ماڈل کار نہیں تھی۔ اس کے پاس صرف تصویریں تھیں، جو اس وقت تمہارے سامنے پڑی ہیں"۔

"یُرگن نے مجھے بتایا تھا کہ ماڈل کاریں بیسمنٹ میں رکھی ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے آلارم سسٹم نصب کیا گیا ہے"۔

"یہی بیسمنٹ ہے، جہاں پر ہم بیٹھے ہوئے ہیں" گیرڈا نے کہا۔ "مکان کے نیچے جو تہہ خانہ ہے، اس کی اونچائی اتنی ہے کہ بارہ تیرہ برس کا بچہ اس میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ رہیں یُرگن کی باتیں، تو تمہیں پتہ ہونا چاہیئے کہ وہ ساری عمر خواہشات کی دنیا میں رہا۔ اسے آخر تک یقین تھا کہ اس کا باپ جنگ میں نہیں مارا گیا اور ایک روز اچانک لوٹ آئے گا۔ ماڈل کاریں خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے ہی کہاں تھے"۔

"ہمیں تو اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک بنک کی برانچ آفس کا مینجر ہے"۔

"یہی بات اس نے مجھے بتائی تھی۔ اور دوسری لڑکیوں کو بھی وہ یہی کہانی سنایا کرتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں ہے کہ وہ اس پر اعتبار کرتی تھیں یا نہیں۔ میں نے اس پر اعتبار کیا تھا۔ اب میں اس کی ماڈل کاروں کی تصویریں سنبھال کر رکھتی ہوں، جیسے وہ بیش قیمت خزانہ ہوں"۔

(کرفیلڈ (جرمنی) - ۲۴ مارچ ۱۹۹۷ء)

شناخت

میں یوگوسلاویہ کے جزیرہ کورچولا پہ کمرہ بک کرائے بغیر پہنچا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ٹورازم نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ ساحلی علاقے کے سارے ہوٹلوں، ہوسٹلوں اور پرائیویٹ گھروں کے کمرے مہینوں پہلے بک ہو جاتے ہوں۔ میرا ارادہ کورچولا میں دو چار روز ٹھہرنے کا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے جگہ پسند آ گئی اور کسی کا ساتھ مل گیا، تو ایک آدھ ہفتہ مزید رک جاؤں گا۔ اس کے بعد آڈریا کے ساحل پر چلنے والے کسی جہاز میں بیٹھ کر آگے یونان چلا جاؤں گا یا ہرزسگوینا کے طول و عرض کو ناپوں گا۔

ہمارا جہاز رات بھر سمندر کی لہروں کے تھپیڑے کھانے کے بعد بہت سویرے کورچولا میں جا کر لنگر انداز ہوا تھا۔ میں اپنا سفری بیگ اٹھائے ہوئے بندرگاہ کی گودی پر اترا، تو بالمقابل کی دوکانوں کے پٹ کھولے جا رہے تھے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر جانتا تھا کہ ٹورسٹ بیورو بھی کہیں آس پاس ہو گا۔ مگر اتنی صبح کون وہاں پر بیٹھا ہوا میرا انتظار کر رہا ہو گا کہ مجھے رہائش کے لئے کمرہ دلوائے۔ میں نے کسی ریستوران میں جا کر ناشتہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ ابھی بند تھے۔ پہلی گلی میں ہی میری نظر ایک ٹریولنگ ایجنٹ کے بورڈ پر پڑی۔ جہاں پر ایک نوجوان لڑکی دوکان کا قفل کھول رہی تھی۔ میں نے اسے صبح بخیر کہا اور پوچھا کہ کیا وہ مجھے ایک اچھا سا کمرہ دلوا سکتی ہے، جس کی کھڑکی سے انسان بندرگاہ کا نظارہ کر سکتا ہو۔

اس نے مجھے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک دیکھا، جیسے میری قیمت لگا رہی ہو۔ اس نے کہا کہ ایسا کمرہ موجود ہے اور مجھے مل سکتا ہے۔ پھر وہ میرے ساتھ چلنے

کے لئے دوکان کے پٹ بھیڑنے لگی۔ میں نے کہا کہ میں وہاں پر جانے سے پہلے ناشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک قریبی ریستوران کے بورڈ پر پڑھا تھا کہ وہاں پر یوگوسلاوین ناشتہ ملتا تھا۔ میں نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ یوگوسلاوین ناشتہ کیسا ہوتا ہے۔ اس نے پھر ایک بار میرا معائنہ کیا اور کہا کہ وہ میرے کام کی چیز نہیں ہے۔ میں یقیناً کانٹی ننٹل ناشتہ کرنے کا عادی ہوں۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے کمرہ پسند آگیا، تو وہاں پر مجھے ناشتہ بھی مل جائے گا۔

ماریا نے پرانی بندرگاہ کے عین وسط میں بنی ہوئی ایک قدیم بلڈنگ کا دروازہ کھولا اور مجھے سب سے اوپر والی منزل پر لے گئی۔ بلڈنگ پرانی تھی، مگر فلیٹ اتنا نیا تھا، جیسے معماروں نے ابھی ہفتہ عشرہ قبل کام مکمل کیا ہو۔ ماریا نے کہا کہ وہ اس کا اپنا فلیٹ ہے اور مجھے کرائے پر مل سکتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ میں کتنا عرصہ ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس بات کا انحصار کرائے پر ہے اور اس بات پر کہ مجھے وہاں کا ماحول پسند آتا ہے یا نہیں۔ اس نے ہفتہ بھر کے لئے جو کرایہ مانگا، اس میں میں جرمنی کے کسی اچھے ریستوران میں دو وقتوں کا کھانا شاید ہی کھا سکتا۔ میں نے فوراً منظور کر لیا۔ ماریا نے کہا کہ وہ دوکان پر جانے سے پہلے مجھے نچلی منزل سے ناشتہ تیار کر کے بھجوا دے گی۔

میں شیو کرنے اور نہانے دھونے کے بعد قصبے کی سیر کو نکل گیا، جس کی پرانی آبادی زمانہ قدیم سے فصیل کے اندر رہتی تھی۔ وہاں کی تنگ گلیوں کے مقابلے میں نئی آبادی کی سڑکیں کھلی تھیں اور مکانات زیادہ کشادہ بنائے گئے تھے۔ اکثر گھروں کے ساتھ باغیچے تھے، جن میں قسم قسم کے پھول بہت بہار دے رہے تھے، قصبہ کے بہت سے باسی کسی نہ کسی طریق سے ٹورازم سے وابستہ تھے۔ بیشتر گھروں کے کمرے ٹورسٹوں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ اور قریب قریب ہر خاندان کے افراد ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کام کرتے تھے یا کوئی چھوٹی موٹی دوکان لگا کر خورد و نوش کا یا دوسرا سامان بیچتے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سیر و سیاحت کا سیزن لگ چکا تھا اور یورپ بھر سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے سامان کی گٹھڑیاں پیٹھ پر باندھے ہوئے رات کے ٹھکانے کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ یہ لوگ اکثر بوجھ

ہوسٹلوں میں ٹھہرتے تھے اور اگر وہاں پر جگہ نہ ملتی تھی، تو خدا کی وسیع زمین پر انہیں کوئی نہ کوئی جگہ کھلے آسمان کے نیچے رات بھر کے لئے پڑ رہنے کو مل ہی جاتی تھی۔

کھانا کھانے کے لئے میں ایک ریستوران میں گیا، جس کے مینیو پہ وہی پانچ چھ قسم کے کباب اور روسٹڈ گوشت کے کھانے درج تھے، جو سارے یوگوسلاویہ میں ملتے تھے۔ مگر انسان کتنے دنوں تک صبح و شام کباب چیچی اور روزنیچی کھا سکتا ہے۔ میں نے ویٹر سے پوچھا کہ کیا وہ میرے لئے مچھلی کی ڈش تیار کرا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ پوچھ کر بتائے گا۔ اس عرصہ میں ایک دلفریب فرانسیسی لڑکی میری میز پر آن کر بیٹھی۔ ویٹر نے واپس آکر کہا کہ مجھے مچھلی مل سکتی ہے۔ باورچی نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ میرے لئے ایسی لذیذ مچھلی پکائے گا کہ میں انگلیاں چاٹتا رہ جاؤں گا۔ لڑکی نے یہ بات سنی، تو اس نے کہا کہ وہ بھی انگلیاں چاٹنا چاہتی ہے۔ اس کو بھی مچھلی کھانے کا شوق تھا۔

فرانسواز بھی میری طرح اکیلی سفر پر نکلی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ ضروری تو نہیں کہ آدمی ان لوگوں کی ہمراہی میں چھٹیاں منانے جائے، جن کے ساتھ اس کا سارا سال گذرتا ہے۔ اس کا تجربہ تھا کہ اس کو ہر ملک میں دلچسپ ہمسفر مل جاتے تھے۔ وہ مجھ سے ایک روز قبل کورچولا میں پہنچی تھی اور قصبے کا جائزہ لے چکی تھی۔ پچھلے پہر اس کا ارادہ جزیرے کے ایک دوسرے حصہ میں جانے کا تھا، جہاں پر ساحل سمندر زیادہ صاف ستھرا تھا اور جہاں پر ٹورسٹ کم ہی پہنچ پاتے تھے۔ پھر اس نے خود ہی تجویز پیش کی کہ اگر مجھے کوئی دوسرا کام درپیش نہ ہو، تو اس کے ساتھ پیراکی کے لئے چلوں۔

فرانسواز جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی اچھی پیراک بھی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ گھوڑ سواری کی دلدادہ تھی اور ہر روز جوگنگ کرتی تھی۔ مگر اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا کہ وہ فرانس کے کس شہر میں رہتی تھی اور کیا کرتی تھی۔ اس نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم بالکل معلوم کرنے کی کوشش نہ کریں کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ چار ہفتوں کے لئے اپنا تشخص بھول جانا چاہتی ہے۔ ہماری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوئی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے پتوں کا تبادلہ نہیں

کریں گے ۔ اور اگر کبھی مستقبل میں ہمارا آمنا سامنا ہو گا ، تو ہم انجانوں کی طرح ایک دوسرے کے پاس سے گذر جائیں گے ۔

میں نے کہا کہ یہ تو ڈرپوکی ہے ۔ آخر آدمی اپنی شناخت کو کیوں چھپائے ۔ صحیح معنوں میں آزاد وہ شخص ہے ، جسے اپنی شناخت کو چھپانا نہیں پڑتا ۔ فرانسواز اس بات سے متفق نہ تھی ۔ اس نے کہا کہ اپنے آپ کو اپنی شناخت سے چند ہفتوں کے لئے جدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ یہ ویسی ہی بات ہے ، جیسے لوگ کارنیوال میں بھیس بدل کر اور نقلی چہرہ لگا کر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں ، جس کی جرأت وہ اپنے جانے پہچانے چہرے کے ساتھ نہیں کر سکتے ۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہاں پریوں بھی کوئی نہیں جانتا ۔ اس لئے اگر ہم اپنی شناخت کو چھپاتے ہیں تو خود اپنے آپ سے ۔ دوسروں کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہماری اصلی اور نقلی شناخت میں کیا فرق ہے ۔ فرانسواز نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے ۔ اگر میں بالفرض شادی شدہ ہوں اور تمہیں اس بات کا پتہ ہے ، تو تمہارا ردعمل وہ نہیں ہو گا ، جو اس وقت ہے ، جب کہ تم سمجھتے ہو کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں ۔

شام پڑنے پر ہم کورچولا واپس لوٹے ۔ فرانسواز میرا کمرہ دیکھنے کے لئے ساتھ گئی ۔ ماریا اور اس کا خاوند رادووان اور اس کا دیور ایوان کرسیاں میز لگا کر اپنے مکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ۔ فرانسواز بھی میری طرح فلیٹ اور کھڑکی میں سے بندرگاہ کے نظارے سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے وہاں پر منتقل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کیا ۔ اس کی رہائش ایک یک منزلہ مکان میں تھی اور اس کے کمرے کی کھڑکی مکان کے پچھواڑے کی طرف کھلتی تھی ۔ ماریا نے فلیٹ کا دوسرا کمرہ فرانسواز کو دینے پر رضامندی کا اظہار کیا ۔ اس طرح فرانسواز میری ہمسائی بن گئی ۔ ماریا کا خاندان بلڈنگ کی دوسری منزلوں پر پھیلا ہوا تھا ۔ سب سے نچلی منزل پر اس کی ساس اور سسر رہتے تھے ۔ پہلی منزل پر اس کا دیور اپنی بیوی صوفیہ کے ساتھ مقیم تھا ۔ تیسری منزل پر ماریا اور اس کا خاوند اپنی بچی نینا کے ساتھ رہتے تھے ۔

اتوار کے روز ماریا کی ایجنسی نے موستار کی سیاحت کے لئے ٹرپ کا پروگرام بنا رکھا تھا ۔ ہم نے بھی گروپ میں اپنے نام لکھوا دیئے ۔ ماریا نے کہا کہ وہ خود ہماری

گائیڈ ہو گی اور ہمیں اپنی بہن ویزنا کے گھر بھی لے جائے گی، جو ایک بوزنیاک مسلمان کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے۔ ماریا بلغراد کی رہنے والی تھی اور آرتھوڈکس چرچ اور سرب قومیت سے تعلق رکھتی تھی۔ جب کہ اس کا خاوند کیتھولک اور کرووات تھا۔ ماریا کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کٹر قومیت پرست تھی۔ اس نے کہا کہ ٹیٹو کو آنکھیں بند کر لینے دو، پھر تم دیکھنا کہ اس ملک میں کیسی تباہی مچتی ہے۔

یوگوسلاویہ کا شمار اس زمانے میں ان کمیونسٹ ملکوں میں ہوتا تھا، جو سویٹ یونین کی سرداری کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ ملک میں ڈکٹیٹر شپ ضرور تھی، مگر ایسی جس میں اسٹالن والی سختی نہ پائی جاتی تھی۔ یوگوسلاویہ کے باشندوں کو ملک سے باہر سفر کرنے کی اجازت تھی۔ بلکہ ان پر دوسرے یورپی ملکوں میں جا کر کام کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس طرح ملک میں باہر سے تھوڑا بہت سرمایہ آتا تھا۔ مغربی ملکوں سے آنے والے ٹورسٹوں کو خوش آمدید کہا جاتا تھا، جن کے دم قدم سے آڈریا کے ساحلی علاقے کے باسیوں کے لئے آمدنی کا ایک زائد ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔

موستار کا شہر اپنی مسجدوں اور دریائے ڈرینا پر بنے ہوئے ترکوں کے وقتوں کے چار صد سالہ پل کی وجہ سے مشہور تھا۔ فرانسواز نے اس کی طرز تعمیر میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پل کی عثمانی قوس دراصل رومن قوس کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ ہمارے گروپ نے پل کے پہلو میں بنے ہوئے ایک ریستوران میں کھانا کھایا، جس کے دوران نماز ظہر کی آذان مسجد کے مینار سے بلند ہوئی، جو کسی راکٹ سے مشابہت رکھتا تھا۔ مؤذن مینار کی گیلری پر چاروں طرف گھوم کر نماز کے لئے بلا رہا تھا۔ پھر ہم نے نمازیوں کو مسجد کی طرف جاتے ہوئے، وضو کرتے ہوئے اور نفل پڑھتے ہوئے دیکھا۔ میرے اندر چھپا ہوا مسلمان جاگ اٹھا اور میں بھی شتابی سے وضو کر کے باجماعت نماز میں شامل ہو گیا۔ فرانسواز نے اس سارے نظارے کی فلم بنائی۔ اس نے کہا کہ مغرب میں مشرق کا ایسا پیوند کسی دوسری جگہ پر نہیں دیکھا جا سکتا۔

ماریا کی بہن ویزنا کا مکان مسلمانوں کے محلہ میں تھا۔ وہاں کا ماحول ترک قصبوں والا تھا۔ ویزنا کی ساس اور نندیں ترکی لباس میں ملبوس تھیں۔ انہوں نے

اپنے گھر کے دیوان خانے میں ہمارا استقبال کیا اور ترکی کافی سے ہماری تواضع کی۔ ویزنا نے اپنے جہیز کا سامان نکال کر دکھایا، جس میں ایک سو ڈیڑھ سو سال پرانا قالین شامل تھا۔ وہ قالین اس کے خاوند بالچ کے خاندان میں نسل بعد نسل بہوؤں کو تحفہ میں دیا جاتا تھا۔ اسے لکڑی کے ایک صندوق میں رکھا جاتا تھا اور صرف تہواروں پر نکال کر ڈیکوریشن کے لئے سجایا جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے دن کی طرح نیا نکور تھا۔ ویزنا نے کہا کہ جب اس کا بیٹا بہو کو گھر لائے گا، تو وہ اس قالین کو بہو کے سپرد کر دے گی۔

میں نے محسوس کیا کہ فرانسواز یہ بات سن کر اندر ہی اندر ابل رہی تھی۔ اس نے وہاں پر تو کچھ نہ کہا، مگر واپسی کے راستے میں اس نے میرے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس نے کہا کہ لوگ روایات کے مردے کی پرستش کب تک کرتے رہیں گے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم ہر بات میں اوائل کی پیروی کریں۔ اس کو یہ بات بھی بالکل پسند نہ آئی تھی کہ بالچ خاندان کی عورتیں ترکوں والا لباس پہنے ہوئے تھیں، جو عام طور سے ان کا روزمرہ کا لباس نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ عورتیں کیوں اپنے آپ کو بنا سنوار کر پیش کرتی ہیں، جیسے ریس کورس میں گھوڑوں کو طرح طرح کی لگاموں، کاٹھیوں اور پھولوں سے سجا کر لایا جاتا ہے۔

مجھے یہ چیز پہلے دن ہی قدرے اوپری لگی تھی کہ فرانسواز ہر قسم کی آرائش اور میک اپ سے عاری تھی۔ مگر میں نے سوچا تھا کہ اس جیسی خوبصورت عورت کو کسی قسم کے رنگ و روغن کی حاجت نہ تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ وہ خود میری میز پر آکر بیٹھی تھی اور اس نے ہی مجھے اپنے ساتھ پیراکی کے لئے چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے خود میرا کمرہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور پھر اپنی مرضی سے میرے فلیٹ میں اٹھ آئی تھی۔

فرانسواز نے کہا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی آزاد نہ تھی۔ وہ ایک کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئی تھی، جہاں پر آزادروی کو بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس کا باپ یوں تو بہت رعب داب رکھتا تھا، مگر اپنی بیوی کے سامنے میمنا بن جایا کرتا تھا۔ فرانسواز کی ماں ایک سیدھی سادی عورت تھی، جس کے اصولوں میں لچک کی کوئی

گنجائش نہ تھی ۔ فرانسواز باپ کو حیلوں بہانوں سے اپنے دام میں کر لیتی تھی اور اپنی ہر بات منوا سکتی تھی ۔ مگر ماں کے آگے اس کی ایک نہ چلتی تھی ۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ آدمی کا حافظہ کمزور ہو، تو اسے ہمیشہ سچ بولنا چاہیئے ۔ اس طرح اس کو زندگی میں کبھی شرمندگی نہیں اٹھانی پڑتی ۔ فرانسواز نے کہا کہ آج کل کون سچ بولتا ہے اور پھر ضروری بھی تو نہیں کہ ایک شخص کی سچائی دوسروں کی بھی سچائی ہو ۔ میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا، کیونکہ فی الواقعہ اسرائیلیوں کی سچائی فلسطینیوں کی سچائی نہیں ہو سکتی ۔

فرانسواز بہت تنوع پسند تھی ۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر روز یکساں قسم کی زندگی گذارنے کے لئے اسے گھر سے باہر قدم دھرنے کی ضرورت نہ تھی ۔ وہ ہر روز کسی نئی جگہ پر جانے، نئے کھانے چکھنے، نئے کپڑے پہننے کی خواہش مند تھی ۔ میں نے کہا کہ مزہ تو تب ہے کہ خود اس کے اندر بھی روز روز تبدیلی آئے، محض ظاہری چیزوں کے بدلنے سے کیا ہوتا ہے ۔ اس نے جواب دیا کہ اس بات کو وہی شخص جان سکتا ہے، جو لمبے عرصہ تک اس کے ساتھ رہے ۔ انسانوں میں بھی ہر آن تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، مگر دو چار ہفتوں میں ان کو دیکھا اور محسوس نہیں کیا جا سکتا ۔

ماریا کی ایجنسی کا دوسرا دورہ ہمیں سرائیوو لے کر گیا ۔ وہاں پر گھومتے پھرتے ہوئے فرانسواز نے ایک اسٹور سے ایک گھڑی ایسی صفائی کے ساتھ اپنی جیب میں ڈال لی کہ سیلز مین کو پتہ تک نہ چلا ۔ میں نے اسے بعد میں کہا کہ گھڑی چرانے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ اس کے پاس اچھی بھلی گھڑی موجود ہے ۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے دکھانا چاہتی تھی کہ اس کے اندر تبدیلی آ سکتی ہے ۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اس کی زندگی کی پہلی اور آخری چوری تھی ۔

بازار میں ایک بازی گر کالے کاغذ کو ایک ڈونگے میں ڈال کر دھو رہا تھا ۔ چند منٹوں کے اندر اندر کاغذ نے ایک سو ڈالر کے نوٹ کی صورت اختیار کر لی ۔ کالے کاغذ کو وہ نصف قیمت پر بیچ رہا تھا ۔ میں نے کہا کہ اگر ڈالر بنانا اتنا آسان ہوتا، تو اسے بازار میں شعبدہ بازی کی ضرورت نہ ہوتی ۔ دوسروں کے ساتھ فرانسواز نے بھی ایک کاغذ خریدا ۔ میں نے کہا کہ اس سے گھڑی کی قیمت وصول کر لی گئی تھی ۔

البتہ وصول کرنے والا شخص اس سے بڑا چور تھا۔ چنانچہ وہی بات نکلی، جس کا مجھے خدشہ تھا۔ کالا کاغذ دھونے کے باوجود سو ڈالر کے نوٹ میں تبدیل نہ ہوا۔ پتہ چلا کہ بازی گر کے کالے کاغذوں کی گڈی میں چند ایک اصلی نوٹ تھے، جن کو صرف وہ جانتا تھا اور جو کسی کیمیکل میں ڈالے جانے سے دھل جاتے تھے۔ جب کہ باقی کے کاغذ کالے رنگ کی معمولی کاغذ تھے، جن کو دنیا کا کوئی پانی سو ڈالر کے نوٹوں میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

ایک دو روز کے بعد رادووان نے ہمیں مچھلی کے شکار پر چلنے کی دعوت دی۔ اس روز ماریا کی ایجنسی کسی تہوار کی وجہ سے بند تھی، اس لئے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لی۔ ہم رادووان کی کشتی میں جزیرے کے ایک ایسے حصہ میں گئے، جس کا شاید ٹورسٹوں کے نقشے پر کوئی وجود نہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں پر شکاریوں کا اچھا خاصا میلہ لگا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ اس روز مچھلی کے شکار کا مقابلہ ہو گا، جس میں ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے۔ ماریا اور رادووان تو شکار کے سازوسامان سے پوری طرح لیس تھے۔ مگر فرانسواز اور میرے پاس دو دو کانٹوں اور ڈوری کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم نے درختوں سے شاخیں کاٹ کر راڈ بنالئے اور بوتلوں کے ڈھکنوں کے کاک ڈوری میں پرو کر کانٹے باندھ کر مقابلے میں شریک ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ماہر شکاریوں کی موجودگی میں ہمیں ایک بھی مچھلی پکڑنے میں کامیابی نہ ہو گی۔ اس لئے ہم نے اپنے کانٹے پانی میں ڈال تو دیئے، مگر ہماری توجہ دوسرے شکاریوں کی طرف لگی ہوئی تھی، جو شاید شکار کرنے سے زیادہ اپنے آلات شکار کی نمائش کرنے کے لئے آئے تھے۔ مجھے مچھلی کے شکار کا تجربہ نہ تھا، مگر فرانسواز اس کی کچھ سدھ بدھ رکھتی تھی۔ اس کا باپ ماہر شکاری تھا اور وہ فرانسواز کو بچپن میں اکثر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ باپ سے اس نے دو ایک گر سیکھے تھے۔ وہ بیٹی کو لمبے انتظار کے لمحات میں بور ہونے سے بچانے کے لئے خود ساختہ کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ میں نے فرانسواز سے فرمائش کی کہ وہ مجھے اپنے باپ کی کوئی کہانی سنائے۔ اس نے کہا کہ اس کو وہ کہانیاں یاد نہیں ہیں۔ البتہ وہ مجھے ایک اپنی خود ساختہ کہانی سنا سکتی ہے۔

اسکی کہانی نورمانڈی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک لڑکی کے بارے میں

تھی ۔اس گاؤں کے پچاس ساٹھ گھروں میں بچوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور گاؤں کا مدرسہ اتنا چھوٹا تھا کہ چاروں کلاسوں کو ایک استاد پڑھاتا تھا ۔ مدرسہ کے سارے بچے ایک کمرہ میں اپنی اپنی کلاسوں کے اعتبار سے الگ الگ بیٹھتے تھے ۔ اور استاد باری باری ہر کلاس کو سبق دیتا تھا ۔اس لڑکی کی کلاس میں ایک لڑکا بھی پڑھتا تھا ۔ دونوں پڑھنے لکھنے میں خوب ہوشیار تھے ۔ان کے درمیان مقابلہ بھی چلتا تھا ، مگر ان کی آپس کی دوستی بھی پکی تھی ۔ جب وہ سیکنڈری اسکول میں پڑھنے کے لئے ایک قریبی قصبہ میں جانے لگے ، تو ان کا جانے آنے کا ساتھ بھی ہو گیا ۔ یہ دوستی آگے چل کر ٹیکنیکل اسکول میں بھی قائم رہی ۔ دونوں نے آرکیٹیکٹ بننے کا فیصلہ کیا اور اپنی تعلیم اور پریکٹیکل ٹریننگ کے بعد ایک تعمیراتی فرم میں ملازم ہو گئے ۔ چند سالوں میں انہوں نے کافی تجربہ حاصل کر لیا اور اپنی علیحدہ فرم قائم کر لی ، جس کا کاروبار ان کی توقع سے بڑھ کر چمکا ۔اس دوران میں وہ شادی کر چکے تھے اور ان کا بیٹا بھی پیدا ہو چکا تھا ۔ فرم کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں تھا ، جہاں پر ان کی اپنی رہائش تھی ۔ پھر ان کی زندگی میں ایک موڑ آیا ، جس کا سبب لڑکی کی اپنی سہیلی بنی ۔ اس نے چوری چھپے اس کے خاوند کے ساتھ تعلقات بڑھائے ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میاں بیوی میں جدائی ناگزیر ہو گئی ۔ چونکہ دونوں فرم میں برابر کے حصہ دار تھے ، اس لئے ان کو اکٹھے کام کرنا پڑتا تھا ۔ قریبی دوستوں کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا کہ ان کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو چکی تھی ۔ دونوں کے درمیان دوستی کا بھرم قائم تھا اور لڑکی کو امید تھی کہ اس کا خاوند ایک روز اس کی طرف واپس لوٹ آئے گا ۔ آخر دنیا امید پر ہی تو قائم ہے ۔

مچھلی کے شکار کا مقابلہ تو ہم نے کیا جیتنا تھا ۔ البتہ پانچ چھ مچھلیاں ہم نے ضرور پکڑیں ، جو ہمارے شام کے کھانے کے لئے کافی تھیں ۔ رادووان کو سب سے پہلی مچھلی پکڑنے کا انعام ملا ۔ مگر اصل انعام سب سے بڑی مچھلی پکڑنے کا اس کے ہمسائے کے حصہ میں آیا ۔ سب لوگوں نے سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے چولہے بنا کر مچھلیاں بھونیں اور ہم آدھی رات کے بعد گھر واپس لوٹے ۔

اس دوران میں ہمارے کورچولا میں قیام کا چوتھا ہفتہ آگیا تھا ۔ ہمارا ارادہ

ایک روز کے لئے ڈوبرونک جانے کا تھا۔ جہاز کورچولا سے شام کو چلتا تھا اور دوسری صبح ڈوبرونک پہنچتا تھا۔ سارا دن وہاں پر قلعہ اور شہر کی سیاحت کے لئے ملتا تھا۔ وہاں کا قلعہ زمانہ ہائے وسطیٰ میں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ فصیل کی مضبوط دیواروں کے اندر بازار پایا جاتا ہے، جو ٹورسٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم ایک اسٹور سے نکل رہے تھے کہ فرانسواز کو ایک جاننے والا جوڑا مل گیا۔ انہوں نے جس خوشی اور مسرت کا اظہار کیا، اس کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ تھا کہ تینوں بہت بے تکلف دوست تھے۔ موریس اور میدلین ایک ہفتہ قبل پیرس سے چلے تھے۔ راستے میں انہوں نے وینس اور پولا کی سیر کی تھی اور ریکا سے ساحلی جہاز لیا تھا، جو راستے میں پڑنے والی بندرگاہوں میں ٹھہرتا ہوا یونان جا رہا تھا۔ وہ کورچولا میں بھی رکے تھے۔ اگر انہیں پتہ ہوتا کہ فرانسواز وہاں پر ٹھہری ہوئی ہے، تو وہ ہر قیمت پر اسے ڈھونڈ نکالتے۔ وہ بھی اسی صبح ڈوبرونک پہنچے تھے اور شام کو آگے جا رہے تھے۔ ہم نے باقی کا سارا دن اکٹھے گذارا۔ اور شام کا کھانا مچھلی کے ایک ریستوران میں کھایا۔ ان کا جہاز ہمارے جہاز سے پہلے روانہ ہو رہا تھا۔ ہم انہیں الوداع کہنے کے لئے گئے۔ بعد میں اپنے جہاز پر لوٹ آئے، جسے رات کے بارہ بجے کورچولا واپس لوٹنا تھا۔

تین بجے کے لگ بھگ میری آنکھ شور کے سبب کھل گئی۔ فرانسواز ٹائیلٹ روم میں قے کر رہی تھی۔ میں دوڑ کر جہاز کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ اس نے کہا کہ فکر کی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ محترمہ کو سمندری متلاہٹ کی بیماری ہے، جس کا شکار بہت سے لوگ ہچکولوں کے لگنے سے ہو جاتے ہیں۔ اس نے ایک دوا دی اور کہا کہ قے سے معدہ خالی ہو جانے کے بعد آرام آ جائے گا۔ مگر فرانسواز کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہوتی چلی گئی۔ اس کو یقین تھا کہ میدلین نے آنکھ بچا کر اس کے کھانے میں زہر ڈال دیا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ ایسا کیوں کرتی اور پھر اس نے ہماری موجودگی میں یہ کام کیسے کیا ہوگا۔ مگر فرانسواز میرے دلائل سننے کو تیار نہ تھی۔ اس نے کہا کہ میدلین ہمیشہ سے موریس کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ فرانسواز کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔ ایک دو گھنٹوں کے بعد مجھے بھی قے آنے لگی۔ لگتا تھا کہ معدہ کٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے وہی دوا دی، جس سے مجھے ذرہ بھر فائدہ نہ ہوا۔

فرانسواز نے کہا کہ اس کی بات درست تھی ۔ میدلین نے نہ صرف اس کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، بلکہ میرے کھانے میں بھی ۔اس طرح وہ عینی گواہ کو ٹھکانے لگانا چاہتی ہے ۔

اگلی صبح ہمیں اسٹریچر پر کورچولا کے ہسپتال میں پہنچایا گیا ۔ہماری حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ ماریا کو ہماری جان کے لالے پڑ گئے ۔ مگر ڈاکٹر نے ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا کہ ہمیں کسی نے جان بوجھ کر زہر نہیں دیا تھا ۔ہم غذائی زہریت کا شکار ہو گئے تھے ۔ تھوڑی دیر میں ریڈیو نے خبروں میں بتایا کہ ڈوبرونک کے ایک ریستوران کا فریزر خراب ہو جانے کے سبب اس میں رکھی ہوئی مچھلیاں پگل گئی تھیں اور مضر صحت بن گئی تھیں ۔ ریستوران کے بے شمار گاہک ہماری طرح کلینکوں میں پڑے ہوئے تھے ۔ موریس اور میدلین بھی یقیناً ایتھنز کے کسی ہسپتال میں داخل ہوں گے ۔

(ٹریزا (جرمنی) ۔ ۲۶ فروری ۱۹۹۷ء)

نقد سودا

فرانکفورٹ کے ہوائی اڈے پر اسرائیل ائر لائنز" ایل آل " کا کاونٹر سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں ہے ۔ اس کے گرد ایک حفاظتی جنگلہ بنا ہوا ہے ۔ چاک وچوبند پہرہ دار اسلحہ سے لیس ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھتے ہیں ۔ میں اپنا سفری بیگ اٹھائے ہوئے وہاں پر پہنچا، تو دوسرے مسافروں کے ساتھ مجھے بھی ایک ایک چیز کھول کر دکھانی پڑی ۔ پوچھا گیا کہ کیا کسی نے کوئی تحفہ، خط یا پیکٹ ساتھ لے جانے کو دیا ہے ۔ میرا جواب نفی میں تھا ۔ جبکہ ان کے کونٹر پر ایک عورت مجھ سے آگے تھی ۔ اس کے پاس چالیس کلو زائد سامان تھا، جس کے لئے وہ سرچارج دینے کو تیار نہ تھی ۔ کبھی کہتی تھی کہ اس کے پاس جرمن مارک کافی نہیں ہیں ۔ پھر دوسرے ہی سانس میں کہتی تھی کہ سارا جہاز خالی جا رہا ہے ۔ اس لئے اگر چالیس کلو زائد سامان ہو گیا، تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا ۔ دوسرے لفظوں میں وہ سرچارج کی چھوٹ چاہتی تھی ۔ اس عرصے میں " ایل آل " کا اسٹیشن کمانڈر بھی کونٹر پر پہنچ گیا ۔ اس نے کہا کہ اگر وہ نصف سامان کا سرچارج دینے کو تیار ہو جائے، تو وہ ایک آنکھ میچتے ہوئے اس کا سامان نکلنے دے گا ۔ محترمہ نے یہ دیکھا، تو ادائیگی سے بالکل ہی مکر گئی ۔ یہ ساری گفتگو انگریزی، جرمن اور عبرانی کی ملی جلی کھچڑی میں ہو رہی تھی اور میں اپنے آپ کو اسرائیل میں پہنچا ہوا محسوس کر رہا تھا، جہاں پر مباحثات زندگی کا جزو ہیں ۔ میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے پیش کش کی کہ محترمہ کے سامان کے دس کلو میرے سامان میں شامل کئے جا سکتے ہیں، کیونکہ میرے سامان کا وزن صرف دس کلو تھا، جب کہ بیس کلو سامان ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے ۔ اس سے محترمہ

کو اور بھی شہ مل گئی ۔ اب بحث صرف دس کلو کے سرچارج کی ادائیگی پر ہونے لگی ۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کو تل ابیب پہنچ کر طے کر لیا جائے گا ۔

لاونج میں راحل ، جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی ، میرے پاس آکر بیٹھی ۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے لئے آئی تھی ، کیونکہ میری پیش کش کی وجہ سے سارا جھگڑا طے ہو گیا تھا ۔ اس نے کہا کہ یہاں سے ایک دفعہ سامان سرچارج کے بغیر نکل جائے ، تو تل ابیب میں کوئی نہیں پوچھے گا ۔ یوں بھی وہاں پر اس کا خاوند اس کو لینے کے لئے ہوائی اڈے پر آئے گا ۔ وہ " ایل ال " کے سارے کارندوں کو جانتا ہے ۔ راحل بڑی صحت مند اور پھرتیلی عورت تھی ۔ باتیں آنکھیں گھما گھما کر کرتی تھی اور موضوع کو اتنی تیزی سے بدلتی تھی ، جیسے چڑیاں ایک ٹہنی سے پھدک کر دوسری پر جا بیٹھتی ہیں ۔ اس نے خاصا شوخ میک اپ کر رکھا تھا ۔ ایک کلائی پر سونے کی گھڑی ، دوسری پر روپہلی بازو بند ۔ گلے میں سچے موتیوں کا ہار ۔ اور قریب قریب ساری انگلیوں پر انگوٹھیاں ، جن میں ہیرے یا دوسرے قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے ۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ہم دونوں سمیت صرف آٹھ مسافر لاونج میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ کیا جہاز خالی جا رہا تھا ۔

" نہیں ، یہ بات نہیں ہے " ۔ راحل نے راز داری سے کہا " ایل آل " کی ہر فلائیٹ نیچے سے اوپر تک سامان سے لادی جاتی ہے ۔ تم کیا جانو کہ یہ لوگ کون کون سی چیزیں ٹرانسپورٹ کرتے ہیں ۔ مسافروں کی کمی کی کسر اس طرح نکال دی جاتی ہے کہ بڑی بڑی بھاری مشینیں اور جنگی سامان فریٹ میں لاد دیتے ہیں " ۔

" تو کیا تم بھی اسی حساب سے اتنی بے شمار چیزیں لے جا رہی ہو " ۔

" سامان میں میری چیزیں تو تھوڑی سی ہیں ۔ باقی سب میری بیٹی کے کھلونے اور دوسرے تحفے ہیں " ۔

" کیا تم بھی کرسمس مناتی ہو ، جو اتنے کھلونے اور تحفے بیٹی کے لئے لے جا رہی ہو " ۔

راحل کھلکھلا کر ہنسی ۔ ہم دسمبر کے مہینے میں کرسمس سے ایک ہفتہ قبل سفر کر رہے تھے ، جو عیسائیوں کا تہوار ہے ۔ یہودی اسے نہیں مناتے ۔ راحل کے

سامان کی مقدار کو دیکھ کر میں نے قیاس کیا تھا کہ شاید اس کے خاندان میں کرسمس منائی جاتی ہو گی۔

"نہیں، یہودی کیوں کرسمس منانے لگے۔ دراصل میری بیٹی یہاں پر جرمنی میں عارضی طور پر مقیم ہے۔ میں اسے ملنے کے بعد واپس جا رہی ہوں۔ یہ تحفے تحائف اسے ان میزبان فیملیوں نے دیئے ہیں، جن کے ہاں وہ یہاں پر رہتی ہے"۔

پتہ چلا کہ راحل کی نو سالہ بیٹی نصف برس سے جرمنی میں مقیم تھی۔ ہر دو تین ماہ کے بعد وہ کسی دوسری فیملی کے ہاں منتقل ہو جاتی تھی۔ جس کا انتظام راحل نے کر رکھا تھا۔ ہر فیملی کی طرف سے اسے تحفے تحائف دیئے گئے تھے، جن کو اب اسرائیل لے جانا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں یہ پوچھ سکتا کہ بچی کی پڑھائی کا کیا انتظام تھا، ہمارے جہاز کی بورڈنگ کا اعلان ہو گیا۔

جمبو جیٹ کے غار نما پیٹ میں آٹھ مسافر دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی بیٹھنے کے لئے کھڑکی والی سیٹ کو چنا۔ ابھی ہمیں پرواز کئے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ راحل اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ گئی۔ آخر اس کو ایک سامع کی ضرورت تھی۔ اور پھر اسے یہ بھی تو معلوم کرنا تھا کہ میرے اس جہاز میں ہونے کا راز کیا تھا۔ میں ایک کانفرنس کے سلسلہ میں تل ابیب جا رہا تھا۔ اتفاق سے راحل اسی شہر میں رہتی تھی۔

"کیا تم وہاں پر کسی کو جانتے ہو"۔ راحل نے پوچھا۔

میرا جواب نفی میں تھا۔ مگر پھر مجھے یاد آیا کہ وہاں پر میریم بھی تو رہتی ہے، جس کے ساتھ میرا طالب علمی کے دنوں میں ملنا جلنا تھا۔ میں نے دوستوں سے سنا تھا کہ اس کے خاندان کا موٹروں کا کاروبار تھا۔ اور یہ کہ ان کے پاس مرسیڈیز کاروں کی ایجنسی تھی۔

"میریم کو تل ابیب میں کون نہیں جانتا"۔ راحل نے جواب دیا۔ "مگر مجھے یقین نہیں ہے کہ میریم ان دنوں میں تل ابیب میں ہو گی۔ وہ سال کا اکثر وقت نیویارک میں گذارتی ہے، جہاں پر اس کے بچے پڑھ رہے ہیں"۔

میریم مجھ سے جونیر تھی اور ہمارے مضمون بھی الگ الگ تھے۔ وہ

سوشیالوجی پڑھتی تھی، جب کہ میرے مضامین سیاسیات اور تاریخ تھے۔ وہ اچانک میرے دوستوں کے حلقہ میں شامل ہو گئی تھی۔ ہماری ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ جب ہمارا گروپ پچھلے پہر کیفے ٹیریا میں جا کر بیٹھتا تھا، تو وہ ہر روز موجود ہوتی تھی۔ مجھے ایک مقالہ اپنے تھیسس کے لئے یروشلم سے منگوانا پڑا تھا، جس کے ایک باب کا میں حوالہ دینا چاہتا تھا۔ مقالہ چونکہ عبرانی میں تھا، اس لئے مجھے ترجمہ کرانے کے لئے میریم کی طرف رجوع کرنا پڑا تھا۔ اس نے ایک دو ہفتوں کے اندر ترجمہ کر دیا تھا اور مجھ سے اس کا معاوضہ لینے کے لئے تیار نہ ہوئی تھی۔

میرے واقف کاروں میں ایک عراقی یہودی بھی شامل تھا، جس کے ساتھ میرا تعارف ہمبرگ میں قیام کے ابتدائی دنوں میں ہوا تھا۔ اس کا نام طارق تھا۔ جب میں نے اسے کہا کہ یہ نام بالکل مسلمانوں والا ہے، تو اس نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ نام عراقی یہودیوں میں بہت مقبول ہے۔ وہ میرے دوسرے دوستوں سے ملنے سے کتراتا تھا، جس کی وجہ میں کبھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے ایک روز مجھے کہا کہ ایک عرب لڑکا حمزہ، جو بحرین کا رہنے والا ہے، میریم کو دھوکہ دینے کے لئے اس کا نام استعمال کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عراقی یہودی بتاتا ہے اور چونکہ ہمبرگ کے یہودی حلقوں میں سب لوگ جانتے ہیں کہ وہاں پر طارق نام کا ایک یہودی لڑکا رہتا ہے، جو عراق کا رہنے والا ہے، اس لئے کسی کو شبہ نہیں ہوا۔ طارق خود سیناگوگ میں نہیں جاتا تھا۔ اس وجہ سے اسے شاید کسی نے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ البتہ اس کے باپ نے ہمبرگ کے ربائی کو اپنے بیٹے کے بارہ میں لکھا تھا۔

انہی دنوں میں ہماری شادی ہوئی تھی اور ہم ہوسٹل سے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ اوتا نے مجھے کہا کہ تم میریم کو کسی روز کھانے پہ بلاؤ۔ میں نے میریم سے اوتا کی اس خواہش کا ذکر کیا، تو وہ فوراً آنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے کہا کہ اگر اسے پسند ہو، تو بیشک اپنے ساتھ کسی دوست یا سہیلی کو لیتی آئے۔ اس نے کہا کہ وہ طارق کے ساتھ آئے گی، جو عراق کا رہنے والا ہے۔ میں نے کہا کہ میں طارق کو خوب جانتا ہوں، اس لئے وہ اسے ضرور اپنے ساتھ لائے۔

اتوار کے روز میریم بناوٹی طارق کے ساتھ ہمارے گھر پر پہنچی، تو وہ مجھ سے کسی قدیمی دوست کی طرح بغل گیر ہو کر ملا۔ میں نے میریم کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ کھانے کی میز پر اس نے سب سے پہلے اپنی پلیٹ کو چاولوں سے لادا اور مرغی کے گوشت پر دھاوا بول دیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میریم نے گوشت کے ڈونگے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ طارق اس عرصے میں ڈٹ کر کھا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میریم کو گوشت کے کوشر ہونے کے بارہ میں شبہ تھا۔ اس لئے اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ طارق اس بات کو بھانپ گیا اور اس نے بھی گوشت والی پلیٹ کو ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کوشر گوشت کا قصہ کیا ہے۔

اصلی طارق سے ملاقات ہونے پر میں نے اسے میریم اور نقلی طارق کے ہمارے گھر پر آنے کا حال سنایا اور کہا کہ میریم کو سمجھ آگئی ہو گی کہ اس کا دوست، جسے کوشر اور غیر کوشر گوشت کے فرق کا علم نہیں ہے، یہودی نہیں ہو سکتا۔ مگر طارق کا کہنا تھا کہ عشق محبت کرنے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ اس لئے اسے امید نہیں تھی کہ میریم نے اس چیز کو نوٹ کیا ہو گا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ کے بعد میریم کو ملٹری سروس کے لئے اسرائیل جانا پڑا۔ اس نے سب دوستوں کو تل ابیب آنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد میریم کے بارہ میں کچھ سننے میں نہ آیا۔

راحل نے کہا کہ اگر میریم تل ابیب میں نہ بھی ہوئی، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ خود میرا خیال رکھے گی۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کسی دوسرے گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی بچی کے وہاں پر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس وقت ہو گا۔

راحل کی پیدائش تل ابیب کی تھی۔ مگر اس کے ماں باپ رومانیا سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اس کے خاوند کا خاندان پولینڈ سے تھا، جہاں پر اس کے بہت سے رشتہ دار نازیوں کے کنسنٹریشن کیمپوں میں مارے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ پھر تو اسے اپنی بیٹی کو جرمنی نہیں بھیجنا چاہیئے تھا۔ راحل نے کہا کہ جرمنوں کی موجودہ نسل کا اس میں بھلا کیا قصور ہے۔ وہ تو ہٹلر کے وقت میں ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ رہا سیاسی یا مذہبی جنون، تو اس سے کوئی قوم بچی ہوئی نہیں ہے۔

ہماری فلائیٹ لیٹ تھی ۔ وہ جمعہ کا روز تھا ۔ پروگرام کے مطابق ہمیں دوپہر سے تھوڑا پہلے تل ابیب پہنچ جانا چاہیئے تھا ۔ مگر فرانکفورٹ سے ہم وقت پر پرواز نہ کر پائے تھے ۔ راحل کو خطرہ تھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے کہیں سبت شروع نہ ہو جائے، جس کا آغاز غروب آفتاب سے گنا جاتا ہے ۔ سبت کے روز یہودیوں کو سفر کرنے، آگ جلانے اور دوسرے کئی ایک کاموں کی ممانعت ہے ۔ "ایل آل" کے طیارے بھی سبت کے روز پرواز نہیں کرتے ۔ اور اسرائیل کے شہروں میں مذہبی جنونی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں ۔ اگر کوئی کار یا بس ان کی آبادی میں بھول کر آ نکلے، تو اس پر پتھراؤ کرتے ہیں ۔ راحل نے کہا کہ اس کا فلیٹ شہر سے باہر ایک ایسے علاقے میں ہے، جہاں پر پہنچنے کا راستہ بنیاد پرستوں کی آبادی میں سے گذر کر جاتا ہے، اگر ہمارے پہنچتے پہنچتے شام پڑ گئی، تو انہیں شہر میں اپنے کسی واقف کار کے گھر پر قیام کرنا پڑے گا ۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر راحل کا خاوند اسے لینے کے لئے آیا ہوا تھا ۔ اس نے مجھے ہوٹل میں پہنچانے کی پیش کش کی ۔ مگر وقت کی تنگی کے پیش نظر میں نے ٹیکسی لینے کو ترجیح دی ۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے عرب سمجھتے ہوئے عربی میں بات شروع کی ۔ میں اس کے لہجہ سے جان گیا کہ وہ مراکو کا رہنے والا تھا ۔ جب اس کو پتہ چلا کہ میں عرب نہیں ہوں، تو اس نے عربوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کر دی ۔ اس کے باپ کو اپنا کاروبار اور گھر بار چھوڑ کر اسرائیل ہجرت کرنی پڑی تھی ۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمہارے ہوش یا شاید تمہاری پیدائش سے بھی پہلے کی بات ہو گی ۔ اس نے بتایا کہ اس وقت اس کی عمر سات برس تھی اور اسے اپنا گھر، گلی، باپ کی دوکان سب کچھ یاد تھا ۔ اس کے ماں باپ اپنے آپ کو اسرائیل میں اجنبی سمجھتے تھے ۔ اگر اس کے باپ کا بس چلے، تو وہ فوراً مراکش واپس چلا جائے ۔

"کیا تم بھی واپس جانا چاہتے ہو" ۔ میں نے پوچھا ۔

"ہاں، مگر صرف بم گرانے کے لئے" ۔ اس نے جواب دیا اور میری طرف داد خواہ نظروں سے دیکھا ۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے سبت کا وقت شروع ہو گیا ۔ لفٹ کے دروازے پر بورڈ لگا

ہوا تھا کہ سبت کے روز بٹن دبانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ لفٹ خودکار تھی اور مسلسل نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چلتی رہتی تھی اور ہر منزل پر رکتی تھی اور دروازہ خود بخود کھلتا اور بند ہوتا تھا ۔ میں نے سوچا کہ رات کو بجلی کون جلاتا اور گل کرتا ہو گا ۔ کمرے کے دروازے پر ایک نوٹس لگا ہوا تھا کہ بجلی شام پڑنے پر خود بخود جل اٹھتی ہے اور نصف شب کو گل ہو جاتی ہے ۔ مگر میرے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہ تھا کہ اگر کسی کو سبت کے روز ٹیلی فون کرنا ہو، تو اس کا کیا انتظام ہے ۔ لوگ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کیسے آن اور آف کرتے ہیں ۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ایک بین الاقوامی سیمینار میں جب ایک یہودی اسکالر کے بولنے کی باری آئی اور اس کا نام پکارا گیا، تو وہ دائیں بائیں جھانکنے لگا ۔ صدر مجلس نے تھوڑے وقفہ کے بعد دوسری بار اس کا نام پکارا ۔ تب مجھے خیال آیا کہ آج جمعہ ہے اور شام پڑ چکی ہے ۔ اس لئے ممکن ہے کہ یہودی اسکالر سبت کی وجہ سے مائیکروفون کا بٹن نہ دبانا چاہتا ہو ۔ میں اس سے کافی دور بیٹھا ہوا تھا ۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر گیا اور میں نے جا کر اس کے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون کا بٹن دبایا ۔ یہودی اسکالر نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنا مقالہ پیش کرنے لگا ۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا کہ تم سبت کے روز سگریٹ کیسے سلگاتے ہو ۔ اس نے کہا کہ اس کام کے لئے ہمارے گھروں میں ایک دیا جلتا رہتا ہے ۔ کھانا گرم کرنے کے لئے ٹائمر اوون کو مقررہ وقت پر خود بخود آن اور آف کرتا ہے ۔

سیمینار اتوار کے روز شروع ہونا تھا ۔ میں نے ہفتے کے روز یروشلم جانے کا پروگرام بنا لیا ۔ ہوٹل نے میری فرمائش پر مجھے ٹیکسی منگوا دی. جس کا ڈرائیور عرب تھا ۔ اس نے بتایا کہ اس کا خاندان دنیا بھر میں بکھر چکا تھا ۔ سات بھائیوں میں سے ایک امریکہ میں تھا، دوسرا فرانس میں اور تیسرا جرمنی میں ۔ دو بھائی اور ایک بہن بیروت کے فلسطینی مہاجروں کے کیمپ میں مقیم تھے ۔ ایک بہن مر چکی تھی ۔ اور چونکہ بڑے بھائی کو عمر قید ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنے ماں باپ کا واحد سہارا تھا ۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کے بھائی کو سیاسی وجوہات کی بنا پر قید کی سزا دی گئی تھی ۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے ہچکچا رہا تھا ۔ پھر اس نے کہا کہ

اس کا خاندان سیاسی معاملات میں بالکل حصہ نہیں لیتا۔ اس کے بھائی کی عمر قید کا تعلق خاندان کی ناموس کے تحفظ سے تھا۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے، کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ فلسطینی عربوں کے ہاں خاندانی ناموس کی حفاظت کی خاطر اپنے خاندان کی عورتوں کو قتل کر دینے کا رواج پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بات وہی نکلی۔ اس کی بہن نے ایک شام گھر سے باہر ایک نوجوان کے ساتھ چند گھنٹے گذارے تھے، جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ اگلی صبح بھائی نے بہن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ بارہ برس قبل پیش آیا تھا۔ اس کا بھائی نصف قید بھگت چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے اپنے بھائی کے اس عمل سے اتفاق ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر بھائی نے خاندان کی ناموس کو نہ بچایا ہوتا، تو وہ یہ فریضہ ادا کرتا۔ پھر اس نے اضافہ کیا کہ اگر وہ کسی عرب ملک میں مقیم ہوتے، تو اس کے بھائی کو ایک دن کے لئے بھی قید خانہ میں نہ جانا پڑتا۔ میں جان گیا کہ اس کے ساتھ اس بارہ میں بحث کرنا فضول ہے۔

میں واپس لوٹا، تو راحل کا پیغام ملا کہ وہ اور یوسی مجھے شام کو لینے کے لئے آ رہے ہیں۔ راحل پہلے روز سے زیادہ شوخ و شنگ لگ رہی تھی۔ یوسی نے کہا کہ وہ مجھے کھانا کھلانے کے لئے ایک ریستوران لے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم کافی ان کے گھر پر جا کر پیئیں گے۔ ان کا فلیٹ ایک بلند و بالا بلڈنگ میں چودھویں منزل پر تھا۔ جو سمندر کے کنارے پر واقع تھی اور جہاں سے میلوں تک نظر جاتی تھی۔ جب ہم آدھی رات کے لگ بھگ وہاں پر پہنچے، تو سمندر پر اکا دکا مچھیروں کی کشتیاں اور بحریہ کے جہازوں کی بتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے دوستوں میں کوئی عرب شامل نہ تھا، اگرچہ ان کے اپنے محکمہ میں عرب کام کرتے تھے۔ دونوں کو عربی کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ جب کہ ان کے عرب کولیگ فرفر عبرانی بولتے تھے۔ انہیں دو ایک بار عربوں نے اپنے تہواروں میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی، مگر وہ نہیں گئے تھے۔ خود ان کے گھر پر کبھی کوئی عرب نہیں آیا تھا یوسی نے کہا کہ عربوں کو ہجرت کر جانی چاہیئے، جیسے یہودی دوسرے ملکوں سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ عرب ملکوں میں ان کو آباد کرنے کے لئے کافی زمین موجود ہے۔ پھر

میریم ہماری گفتگو کا مرکز بن گئی ۔ راحل نے بتایا کہ اس نے میریم کو نیویارک فون کیا تھا اور اسے میری آمد کی اطلاع دی تھی ۔ میریم یوں بھی تل ابیب آنے والی تھی ۔ اس نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ جمعرات کے روز پہنچ جائے گی اور مجھے اس کی آمد سے پہلے واپس نہ جانا چاہیئے ۔

اگلے تین روز سیمینار کے سبب میرے لئے بہت مصروفیت کے تھے ۔ دن میں دو اجلاس ہوتے تھے اور شام کو ڈنر پر جانا ہوتا تھا ۔ میں راحل اور یوسی سے بھی ان دنوں میں رابطہ نہ رکھ سکا ۔ چوتھے روز سویرے سویرے راحل کا فون آگیا کہ میریم دوپہر کو تل ابیب پہنچ رہی ہے اور اس نے مجھے شام کو اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی ہے ۔ راحل اور یوسی اس شام ایک دوست کی بیٹی کی شادی پر مدعو تھے ، اس لئے وہ جاتے ہوئے مجھے میریم کے ہاں چھوڑتے جائیں گے ۔

میریم کا فلیٹ شہر کے بہت مہنگے علاقے میں تھا ۔ عمارت کے دروازے پر دو مسلح پہرے دار بیٹھے ہوئے تھے ۔ یوسی نے بتایا کہ اس عمارت میں ایک وزیر رہتا ہے ، جس کی وجہ سے حفاظت کا خاص انتظام ہے ۔ میریم نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا ۔ ہم اسے طالب علمی کے دنوں میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی وجہ سے ہرنی کہہ کر پکارتے تھے ۔

" ہرنی تمہارا حسن اور زیادہ نکھر گیا ہے " ۔ میں نے میریم سے کہا اور اسے چوم لیا ۔

" اور تمہارا قد بالکل نہیں بڑھا ۔ بلکہ لگتا ہے کہ تم کچھ گھس گئے ہو " ۔ میریم فقرے کسنے میں کسی سے پیچھے نہ رہتی تھی ۔

میریم کا فلیٹ اچھا بھلا میوزیم لگ رہا تھا ۔ ڈیکوریشن کا جواب نہ تھا ۔ فرنیچر بے حد نفیس تھا اور دیواروں پر اوریجنل پینٹنگز لٹک رہی تھیں ۔ فرش پر ایک سے ایک عمدہ قالین بچھے ہوئے تھے ۔ میں نے اسی روز اپنے ہوٹل کے پہلو کی ایک دوکان میں ایرانی قالین دیکھے تھے ، جن میں سے ہر ایک کی مالیت بیس ہزار ڈالر سے اوپر تھی اور میریم کے قالین کوالٹی میں ان سے کسی طرح گھٹیا نہ تھے ۔ راحل مجھے بتا چکی تھی کہ میریم کا شمار ملک کے کروڑ پتیوں میں ہوتا تھا ۔ میریم نے بتایا کہ اس کا کاروبار

بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس کی فرم کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں تھا، جس کے سبب اس کا بہت سا وقت وہاں پر گذرتا تھا۔ وہیں پر اس کے اکثر رشتہ دار اور دوست یار رہتے تھے۔

میں اس کے خاوند کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ میری نظر اس کے ہاتھ کی اس انگلی پر پڑی، جس پر لوگ شادی کی انگوٹھی پہنتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اس انگلی پر دو انگوٹھیاں چڑھا رکھی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بیوہ تھی۔ میں نے گلہ کیا کہ اس نے کبھی بھول کر بھی ہمبرگ کا رخ نہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ تو سمجھتی تھی کہ ہمارے دوستوں میں سے وہاں پر اب کوئی مقیم نہ ہو گا۔ اس کی بات درست تھی۔ میں اس شہر میں طالب علمی کے زمانے کی آخری یادگار تھا۔ میں نے کہا کہ شاید طارق بھی وہیں پر ہو گا، مگر ایک عرصہ سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ اس نے پڑھائی کو خیرباد کہہ کر قالینوں کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

میریم نے کہا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ قالینوں کا کاروبار طارق نے نہیں شروع کیا تھا، بلکہ حمزہ نے، جو بحرین کا رہنے والا تھا۔ چنانچہ جب میریم نے ہمبرگ کو چھوڑنے سے پہلے خفیہ طور پر طارق سے شادی کی، تو حمزہ اور اس کی ایک سہیلی ان کے نکاح کے گواہ بنے تھے۔ میریم کو یہ خطرہ تھا کہ اس کے ماں باپ اس کی شادی کی مخالفت کریں گے۔ جب کہ طارق کے والدین عراق میں فوت ہو چکے تھے ان کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔

اتنے میں میریم فوٹو البم مجھے دکھانے کے لئے اٹھا لائی۔ اس میں اس کی شادی کی تصویر بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پہلو میں نقلی طارق کھڑا تھا۔ میں سخت مخمصے میں تھا کہ میریم کو کیسے کہوں کہ اس کا خاوند یہودی نہیں بلکہ عرب تھا۔ میں نے کہا کہ اسے یاد ہو گا کہ جب وہ طارق کے ساتھ ہمارے ہاں آئی تھی، تو اسے کوشر اور غیر کوشر گوشت میں فرق کا علم نہیں تھا۔ میریم نے کہا کہ دراصل طارق کا بچپن مسلمانوں کے ماحول میں گذرا تھا، جس کے سبب اسے یہودی رسوم و رواج اور مذہبی باتوں کا پتہ نہیں تھا۔ اسے بھی اس بات پر تعجب ہوا تھا، مگر طارق نے اس کو بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اپنے گرد و پیش کے تشدد سے بچنے کے لئے اسے

یہودیت کی تعلیم نہ دی تھی ۔ اسکول میں وہ اپنی کلاس میں واحد یہودی تھا ۔ اس لئے اس نے کبھی کسی کو اپنے مذہب کے بارہ میں نہیں بتایا تھا ۔ اسکول میں طالب علموں کو اسلامی دینیات پڑھائی جاتی تھی ۔ جس کے سبب طارق کو اسلام کے متعلق بہت کچھ پتہ تھا ۔ اس کو قرآن کی کئی سورتیں زبانی یاد تھیں ۔ اسے نماز بھی پڑھنی آتی تھی ۔ میریم نے کہا کہ وہ خود بہت زیادہ مذہبی نہیں ہے ۔ بس دو چار باتیں ایسی ہیں جو اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں اور جن کا وہ خیال رکھتی ہے ۔ جیسے کوشر گوشت اور سبت کا احترام ۔ وہ مذہبی تہواروں پر سینا گوگ بھی چلی جاتی ہے ۔ یہ باتیں طارق نے بھی اختیار کر لی تھیں ۔ اسرائیل آجانے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی مذہبی ہو گیا تھا ۔ بلکہ ایک مذہبی سیاسی پارٹی کا ممبر بن گیا تھا ، جو اسرائیل کو عربوں سے پاک کرنے کا پرچار کرتی تھی ۔ طارق نے اسرائیل میں لازمی ملٹری سروس بھی کی تھی اور بمبار طیارے کا پائلٹ بن گیا تھا ۔ جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا ، تو اس نے ایک رات میں اپنے اسکوڈرن کے ساتھ بارہ حملوں میں حصہ لیا تھا اور سارے ٹارگٹ کامیابی کے ساتھ تباہ کر دیئے تھے ۔ اس پر اس کو بہادری کا تمغہ دیا گیا تھا ۔ مگر اس جنگ سے وہ زندہ واپس نہیں لوٹا تھا ۔ اس نے اپنی جان اسرائیل کے لئے قربان کر دی تھی ۔ جنگ بندی کے بعد لبنان کی حکومت نے جب اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں واپس کیں ، تو ان میں طارق کی لاش بھی شامل تھی ۔ پھر میریم اس کے کاغذات اٹھا لائی ، جن میں اسکول کی سندات ، بغداد کے ربائی کا تصدیقی خط اور اس کا عراقی پاسپورٹ شامل تھے ۔ ہم دیر تک پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے اور اس زمانے کے سارے لطیفے ہم نے ایک دوسرے کو سنائے ، جو ہمیں یاد تھے ۔ آدھی رات کو میریم مجھے ہوٹل میں چھوڑ گئی ۔

دوسرے روز ہمبرگ واپس پہنچ کر میں نے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں سے طارق کا نمبر تلاش کر کے اسے فون کیا ۔ وہ میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان گیا ۔ کہنے لگا کہ تم اب تک کہاں پر چھپے ہوئے تھے ؟ میں نے کہا کہ میں تل ابیب میں اس کی بیوہ میریم سے مل کر آرہا ہوں ۔ طارق نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور بتایا کہ حمزہ نے اس کو دس ہزار مارک ادا کر کے اس کے سارے کاغذات خرید لئے تھے ، جن کی اسے یوں

بھی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس نے جرمن شہریت اختیار کر لی تھی۔ ایک پروفیشنل جعل ساز نے اس کی تصویر کو ہٹا کر حمزہ کی تصویر کو پاسپورٹ میں ایسی صفائی کے ساتھ لگا دیا تھا کہ ذرہ بھر شبہ نہ ہو سکتا تھا۔

اس نے کہا: "تم جانتے ہو کہ اس زمانے میں دس ہزار مارک کتنی بڑی رقم تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ چند بے قیمت کاغذات کے عوض اگر مجھے اتنے پیسے نقد مل جائیں، تو سودا برا نہیں ہے۔ حمزہ کو اس کی میریم مل گئی اور مجھے اپنی تجارت کے لئے سرمایہ میسر آگیا"۔

(کمرفیلڈ (جرمنی) ۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء)

اکلاپا

مجھے اس سے ملے ایک عمر ہو چکی ہے۔ ایک زمانے میں ہم سال میں دو تین بار ضرور ملتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقاتوں میں وقفہ پڑنے لگا۔یہاں تک کہ یہ سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔پہلے سالوں میں جب کبھی مجھے اس کے شہر سے گذرنا ہوتا تھا، تو میں اطلاع کر دیتا تھا اور وہ ریلوے اسٹیشن پر آجاتی تھی۔ اگر میرے پاس رات بھر رکنے کے لئے وقت ہوتا تھا، تو وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاتی تھی، وگرنہ ہم کسی ریستوران میں جا کر بیٹھتے تھے اور دو تین گھنٹے اکٹھے گذارتے تھے۔ اس کا باتیں کرنے کا انداز مجھے پیارا لگتا تھا۔ باتیں اس کے منہ سے یوں نکلتی تھیں، جیسے پھوار گرتی ہو۔ اسے الفاظ کا چناؤ کرنے پر یا فقروں کو ترتیب دینے میں ذرہ بھر محنت نہ کرنی پڑتی تھی۔ فقرے گھڑے گھڑائے اس کے منہ سے نکلتے تھے، جو اتنے مکمل اور برجستہ ہوتے تھے کہ میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کسی بھی ادب پارے میں جان ڈال سکتے ہیں۔ میں نے اسے کئی بار کہا کہ اپنے اندر چھپی ہوئی ادیبہ کو باہر نکالو، مگر وہ ہنس کر بات کو ٹال جاتی تھی اور کہتی تھی کہ اسے اپنی زندگی کی کہانی کو تشکیل دینے سے فرصت نہیں ملتی، دوسروں کی کہانیوں کو لکھنے کے لئے وقت کہاں سے لائے۔

ہمارا تعارف ریل گاڑی کے ایک سفر کے دوران ہوا تھا۔ میں اس روز برتھولٹ بریشٹ کی نظموں کا مجموعہ ساتھ لے کر گیا تھا۔ اتفاق سے میں کمپارٹمنٹ میں اکیلا تھا اور مطالعہ میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے گاڑی کے اسٹیشن پر رکنے کا بالکل پتہ نہ چلا۔ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز اور نفیس عطر کی خوشبو کے لپکوں سے میں جان گیا کہ جنس لطیف کا کوئی فرد میری تنہائی میں مخل ہو رہا تھا۔ اس نے

صبح بخیر کہا اور رواج کے مطابق پوچھا کہ کیا کمپارٹمنٹ کی کوئی سیٹ خالی ہے ۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا ۔ میرے سامنے لیونارڈو داونچی کی مونا لیزا کھڑی تھی ۔ میں نے کہا کہ قریباً سارا ڈبہ خالی ہے ۔ ساتھ ہی میں نے پیش کش کی کہ اگر وہ پسند کرے ، تو میں اس کا سوٹ کیس سامان والی برتھ پر اٹھا کر رکھ دوں ۔ اس نے میری پیش کش کو منظور کیا اور میرے بالمقابل والی سیٹ کو بیٹھنے کے لئے چنا ۔

میں پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہوا اور نظم کا وہ شعر تلاش کرنے لگا ، جو میری ہم سفر کے ڈبہ میں داخل ہونے کی وجہ سے نامکمل رہ گیا تھا ۔ میں نے محسوس کیا کہ مونا لیزا تجسس بھری نظروں سے میرے قلم کا پیچھا کر رہی تھی ۔ اس نے جاننا چاہا کہ کیا میں عربی زبان لکھ رہا ہوں ، جس کے بارہ میں اسے پتہ تھا کہ وہ دائیں سے بائیں ہاتھ کو لکھی جاتی ہے ۔ میں نے بتایا کہ میں عربی رسم الخط میں اردو لکھ رہا ہوں ۔ اس نے میری نوٹ بک کو لے کر غور سے حروف کی بناوٹ کو دیکھا اور کہا کہ اسے کیڑوں مکوڑوں کی ٹانگوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ پھر اس نے فرمائش کی کہ میں اس رسم الخط میں اس کا نام کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر دوں ۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے وہ نام قابل قبول ہو گا ، جو میں نے اسے دل ہی دل میں دے رکھا ہے یا وہ مجھ سے اپنا اصلی نام لکھوانا چاہتی ہے ۔ اس نے وہ نام جاننا چاہا ، جو میں نے اسے دے رکھا تھا ۔ میرا خود ساختہ نام سن کر اس کے لبوں پر ویسی مسکراہٹ پھیل گئی ، جس کے سبب مونا لیزا دنیا بھر میں مشہور ہے ۔ اس نے کہا کہ اسکا نام ایلیزابتھ ہے ، مگر اسے بچپن سے لیزا کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ اس دلچسپ توارد پر ہم دونوں دل کھول کر ہنسے ۔

لیزا کی عمر اس وقت چوبیس پچیس کے لگ بھگ تھی ۔ وہ میانے قد کی خوبصورت لڑکی تھی ۔ جب اس نے اپنے بیگ میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنی شروع کی ، تو میں نے قیاس کیا کہ وہ یونیورسٹی کی طالبہ علم ہو گی ۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں اپنے تجسس کی تسکین کے لئے کوئی سوال پوچھتا ، اس نے جاننا چاہا کہ کیا میں برتھولٹ بریشٹ کی نظموں کا ترجمہ کر رہا ہوں ۔ اس زمانے میں مغربی جرمنی میں

بریشٹ کو تیکھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، کیونکہ وہ کیمونسٹ تھا اور اس نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جلا وطنی سے واپسی پر سوشلسٹ مشرقی جرمنی میں قیام کرنا پسند کیا تھا۔ معاشرہ کے برعکس یونیورسٹی کے طالب علموں میں اس کی نظمیں اور ڈرامے بہت مقبول تھے۔ جب میں ایک بار ہمبرگ یونیورسٹی کے طالب علموں کے ایک گروپ کے ہمراہ برلن گیا، تو پہلی ہی شام سارا گروپ مغربی برلن کی بلدیہ کی دعوت طعام کو ٹھکرا کر مشرقی برلن میں بریشٹ کے تھیٹر میں ایک ڈرامہ دیکھنے کے لئے چلا گیا تھا۔ بلدیہ کے کارندوں کو ہماری یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم بلدیہ کی دعوت اور اس کے خرچ پر برلن آئے تھے، اس لئے ہمیں ان کے پروگرام کا پاس کرنا چاہیئے تھا۔ مگر طالب علموں نے ان کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا کہ وہ جرمن زبان کے اہم ترین تھیٹر میں بریشٹ کا ڈرامہ دیکھنے کے لئے گئے تھے، جس پر کوئی نا بلد ہی اعتراض کر سکتا ہے۔ میں نے لیزا کو اس سفر کے دوران طالب علموں اور بلدیہ کے کارندوں کے درمیان لڑی جانے والی سرد جنگ کے قصے سنائے، تو وہ بہت محظوظ ہوئی۔ پتہ چلا کہ اس کی ہمدردیاں بھی میری طرح بائیں بازو کے ساتھ تھیں۔ مگر اس بات میں اس کی یا میری کوئی خصوصیت نہ تھی۔ ان دنوں میں مغربی جرمنی کی یونیورسٹیوں میں سوشل ازم بے حد مقبول تھا۔ مغربی جرمنی کے معاشرہ کے ساتھ طالب علموں کا ایک مستقل جھگڑا چل رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب امریکی استعمار ویتنام میں جمہوریت کی جنگ لڑ رہا تھا اور یورپی شہروں میں شمالی ویتنام کے حق میں مظاہرے ہوتے تھے۔

پتہ چلا کہ لیزا تھوڑا عرصہ پہلے ایک قصبے کے جمنازم مدرسہ میں استانی لگی تھی اس کے اپنے الفاظ میں وہ قصبہ اس قدر دور دراز علاقے میں واقع تھا، جہاں پر لومڑیاں ایک دوسرے کو شب بخیر کہتی ہیں۔ اس نے کہا کہ تم وہاں کے لوگوں کی قدامت پسندی کا تصور نہیں کر سکتے۔ اتوار کے روز سارا قصبہ چرچ کے گیٹ پر یہ دیکھنے کے لئے جمع ہوتا ہے کہ کون کون چرچ سروس میں شامل ہو رہا ہے اور کون غیر حاضر ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ مدرسہ کی استانی فیشن ایبل بالوں کے ساتھ یا منی اسکرٹ میں ملبوس سڑک

پر قدم دھرنے کی جرأت کرے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ ایسا کرے، تو کون سی قیامت آجائے گی۔ لیزا نے کہا کہ کیا یہ چیز کم ہے کہ اس عمل کے نتیجہ میں قصبے کا ٹریفک رک سکتا ہے اور شہر کا امن و امان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرتے ہیں اور استانی پر انگلیاں اٹھتی ہیں، جو اپنے طرز عمل سے ان کی اولاد کے اخلاق کو بگاڑ دے گی۔

میرا واسطہ اس وقت تک جرمنی کے بڑے شہروں سے پڑا تھا، جہاں پر لوگ روایات کو توڑنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اس معاملہ میں ہر کوئی دوسروں پر سبقت لے جانے کی فکر میں رہتا تھا۔ آخر انہیں ثابت کرنا ہوتا تھا کہ وہ نئے وقتوں کے تقاضوں کو سمجھتے اور ان کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں۔ کسی چیز کے بارہ میں اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ وہ ماڈرن ہے۔ فوراً ہر کوئی اسے اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس چیز سے انڈسٹری خوب فائدہ اٹھا رہی تھی اور ایک سے ایک ماڈرن چیزیں مارکیٹ میں پھینکی جا رہی تھیں، جن کو خریدنے کے سوا لوگوں کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جو کوئی اپنا ماڈرن ہونا منوانا چاہتا تھا، اس کے لئے لازمی تھا کہ اس کے پاس تمام ماڈرن چیزیں پائی جاتی ہوں۔ اس زمانے میں کپڑوں کے فیشن میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔ اور لڑکیوں کے اسکرٹ دن بدن سکڑتے جا رہے تھے۔

ہمارا ساتھ اس سفر کے دوران شاید دو گھنٹوں سے زیادہ کا نہ تھا۔ مگر ہم اس مختصر وقت میں ایک دوسرے سے اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ لیزا نے گاڑی سے اترتے ہوئے مجھے اپنا پتہ لکھ کر دیا اور میرا پتہ نوٹ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے اس کا ایک ویو کارڈ مراکش سے ملا، جہاں پر وہ موسم خزاں کی چھٹیاں منانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ دوسرا خط کرسمس کے دنوں میں ملا، جو دراصل سائیکلو اسٹائل شدہ چار صفحے کا سرکلر تھا، جس میں سال بھر کی مصروفیات کے حوالے سے دلچسپ رپورٹ درج تھی۔ لیزا نے لکھا تھا کہ اس کے دوستوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ ہر کسی کو فرداً فرداً خط نہیں لکھ سکتی۔ اس لئے سب کو سرکلر بھیج رہی ہے۔ سرکلر میں اس نے اپنے قصبہ کی خوب تنقیص کی تھی اور لکھا تھا کہ وہاں پر آکر بسنے کے بعد اسے پتہ چلا تھا کہ انسان کیوں کر ایک

بھرے پرے شہر میں اکلاپے کا شکار ہو سکتا ہے ۔ ساتھ ہی اس نے اپنے دوستوں کو کھلی دعوت دی کہ جس کسی کا اس قصبے کے قرب وجوار سے گذر ہو، وہ اسے ملنے کے لئے ضرور آئے ۔ اس کے پاس مہمانوں کو ٹھہرانے کے لئے کافی جگہ تھی ۔

اتفاق سے ایک دو مہینوں کے بعد میرا لیزا کے علاقے میں ایک تقریر کے سلسلہ میں جانا ہوا ۔ میں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع دی اور لکھا کہ میں واپسی کے راستے میں سنیچر کے روز چند گھنٹوں کے لئے وہاں پر رکوں گا ۔ اس نے واپسی ڈاک سے لکھا کہ یہ چند گھنٹوں کا مذاق کیا ہوا ۔ تمہیں پورا ویک اینڈ میرے پاس گذارنا ہو گا ۔

لیزا ریلوے اسٹیشن پر میری منتظر تھی ۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلے ۔ اس نے جواب دیا کہ اگر میں اس کے گھر پر نہیں ٹھہرنا چاہتا تو مجھے اگلی گاڑی لے لینی چاہیئے، جو ایک گھنٹے میں آئے گی ۔ میں نے کہا کہ میں اس کی قصبے میں بد نامی کا باعث نہیں بننا چاہتا، جہاں پر سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ جمنازیم میں استانی ہے اور غیر شادی شدہ ہے ۔ لیزا نے کہا کہ وہ اس بات کو خوب سمجھتی ہے ۔ اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں ہے کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا سوچتے ہیں ۔ لوگوں کو اپنے گھروں کے آگے جھاڑو دینا چاہیئے ۔ وہ ایک آزاد ملک کی آزاد شہری ہے اور اپنی پرائیویٹ زندگی میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دینا چاہتی ۔

لیزا کا فلیٹ خاصا کشادہ تھا، جس میں اس کے دوستوں کا ایک پورا جتھا ٹھہر سکتا تھا ۔ البتہ اس کے پاس مہمانوں کے لئے صرف دو بیڈ تھے ۔ اگر دو سے زیادہ دوست بیک وقت آتے، تو انہیں فرش پر سونا پڑتا ۔ لیزا نے کہا کہ وہ اس قصبے میں پنشن پانے کی عمر تک رہنے کا ارادہ نہیں رکھتی ۔ وہ شہری پودا ہے، جس کو دیہاتی آب وہوا راس نہیں آتی ۔ اس قصبہ میں نہ تو میوزک کانسرٹ ہوتے تھے اور نہ ہی دور و نزدیک کوئی تھیٹر پایا جاتا تھا ۔ جب کہ لیزا مہینے میں دو تین بار میوزک کانسرٹوں، اوپیرا یا تھیٹر میں جانے کی عادی تھی ۔ غضب تو یہ تھا کہ اس قصبہ کے واحد سومنگ پول میں ننگے دھڑنگے نہانے کی ممانعت تھی ۔ ٹینس کلب میں لیزا کو

داخلہ تو مل سکتا تھا، مگر وہاں پر شادی شدہ جوڑوں کا راج تھا۔ اکیلی دکیلی عورت کے لئے کلب کانٹوں کی سیج سے کم نہ تھا۔ لیزا کو اس کے مدرسہ کے ساتھیوں نے مشورہ دیا تھا کہ کلب کی ممبری سے اجتناب کرے۔ یوں بھی کلب کے داخلہ کی فیس اس کی مہینے بھر کی تنخواہ کے برابر تھی۔

لیزا نے اس قصبے میں ایک بھی دوست نہ بنایا تھا۔ جمنازیم کے استادوں کے ہاں اس کا آنا جانا ضرور تھا، مگر اکثر شادی شدہ تھے اور جو شادی شدہ نہ تھے، وہ لیزا کے الفاظ میں "کنڈم" مال تھے۔ اس کے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست یار بہت تھے، تاہم ان میں سے کوئی اس علاقے میں نہ رہتا تھا۔ ان کے ساتھ اس کا ملنا تعطیلات میں ہوتا تھا اور وہ ان کی ہمراہی میں دور دراز ملکوں کی سیاحت کو جاتی تھی۔ مراکش کا سفر اس نے منفرڈ کی معیت میں کیا تھا، جو لیزا کی طرح کسی جمنازم میں استاد تھا۔ منفرڈ یوں تو خاصا دلچسپ آدمی تھا اور لیزا اسے پسند کرتی تھی، مگر اس کے ساتھ پوری زندگی بسر کرنے کا خیال آتے ہی اس کو جھرجھری آجاتی تھی۔ منفرڈ کو بیئر پینے کا شوق تھا اور جب تک وہ شام کے دوران دوچار لیٹر پی نہ لیتا تھا اس کو نیند نہ آتی تھی۔ لیزا کو نظر آرہا تھا کہ منفرڈ کی شراب نوشی اسے کہاں پر لے جائے گی۔

ویک اینڈ بہت دلچسپ گزرا۔ لیزا نے میرے لئے سیر و تفریح کا باقاعدہ پروگرام ترتیب دے رکھا تھا، جس میں ایک تاریخی قلعہ کی سیاحت اور لمبی سیریں شامل تھیں۔ لیزا کے پاس اس کے سفروں کی بیشمار سلائیڈیں تھیں، جن میں اس کے دوستوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ مراکش کے سفر کی سلائیڈیں انہی دنوں میں آئی تھیں اور لیزا بھی انہیں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اس کی بات درست تھی منفرڈ کی توند کسی حاملہ کی طرح نکلی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر الکحل لکھی ہوئی دکھائی دیتی تھی لیزا کے دوستوں میں مجھے فرانز اچھا لگا، جس کے ساتھ وہ گرمیوں کی تعطیلات میں چین کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ دونوں کے درمیان کلاسیکی موسیقی سے پیار قدر مشترک تھا۔ چنانچہ وہ اکثر ڈیٹر فیشر ڈیسکاؤ کے گانوں کی پرفارمنس میں شمولیت کے لئے دور دراز تک سفر کر کے جاتے تھے۔ ان کی ملاقات کسی ایسے ہی موقعہ پر ہوئی تھی۔ فرانز پیشہ کے اعتبار سے انجنیر تھا۔ اس لئے اس کو سال بھر میں چھ ہفتے کی

چھٹیاں ملتی تھیں ۔ جب کہ اسکول کے استادوں کو کم و بیش تین ماہ کی تعطیلات ہوتی ہیں ۔ لیزا ان استادوں میں سے تھی، جو سال میں تین چار بار غیر ملکوں کا سفر کرتے ہیں ۔

اسی سال کے موسم خزاں میں میرے شہر ہمبرگ میں مصری فرعون توت انخ آمون کے آثار کی نمائش لگی، تو لیزا بھی اسے دیکھنے کے لئے آئی ۔ وہ الاُقصر میں اس کے مزار کی زیارت کر چکی تھی اور اس کے آثار کو قاہرہ کے دارالمتحف میں دیکھ چکی تھی ۔ مگر جب توت انخ آمون خود چل کر جرمنی آئے، تو واضح ہے کہ وہ اس کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی ۔ لیزا کا چین کا سفر خاصا دلچسپ رہا تھا ۔ مگر فرانز نے اسے مایوس کیا تھا، کیونکہ اس میں خود غرضی اور نرگسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ لیزا کا کہنا تھا کہ فرانز اپنی ذات کے سوا نہ تو کسی کو دیکھتا ہے اور نہ ہی کسی اور سے محبت کرنے کی اہلیت رکھتا ہے ۔ اس سے پہلے ان کا ملنا وقفوں کے بعد ہوتا تھا اور وہ ایک آدھ دن سے زیادہ اکٹھے نہ گذارتے تھے ۔ اس لئے اس کی ذات کا انکشاف لیزا پر نہ ہوا تھا ۔ چین کا سفر پورے ایک مہینے پر محیط تھا، جس کے دوران وہ رات دن یکجا رہے تھے اور ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہ ہوئے تھے ۔ لیزا نے کہا کہ سفر کے اختتام پر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ان کا ساتھ زندگی بھر کے لئے نہ تھا ۔ لیزا نے اگلا سفر اکیلی کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جو اسے صنعاء لے جائے گا ۔

صنعاء سے لیزا نے مجھے ایک کارڈ بھیجا اور یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ایک ایسا ساتھی مل گیا تھا، جس کے ہمراہ اگر اسے جہنم میں بھی جانا پڑے، تو وہ بخوشی جانے کو تیار تھی ۔ تفصیلات اس نے آئندہ ملاقات پر سنانے کا وعدہ کیا ۔ جس کا موقعہ مجھے جلد پیدا کرنا چاہیئے ۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے ایک سیمینار میں تقریر کرنی تھی ۔ میں نے لیزا کو اس سیمینار میں شامل ہونے کی دعوت بھجوائی، تو وہ آنے کے لئے تیار ہو گئی ۔ مجھے یمن کے سفر کے حالات سننے اور یہ جاننے کا شوق تھا کہ اس کو زندگی کا ساتھی کہاں پر اور کیسے ملا تھا ۔

میری توقع کے برعکس وہ یمنی نہیں بلکہ جرمن تھا، جو کئی سالوں سے وہاں پر

مقیم تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ پائلٹ تھا۔ اس کا اپنا ذاتی جہاز تھا، جسے وہ کرائے پر چڑھاتا تھا اور ٹورسٹوں کو تاریخی مقامات کی سیر کراتا تھا۔ لیزا کا تعارف اس کے ساتھ ایک ٹرپ کے سلسلہ میں ہوا، جو اس نے حضر موت جانے کے لئے بک کی تھی۔ اس روز وہ یُرگن کی اکیلی سواری تھی۔ لیزا اس کی باتیں اور ایڈونچر کی داستانیں سن کر بے حد متاثر ہوئی تھی۔ پھر وہ یُرگن کے ساتھ شبوطی بھی گئی، جہاں پر وہ یمن آنے سے پہلے رہ چکا تھا۔ لیزا نے محسوس کیا کہ یُرگن ویسی آزادانہ زندگی بسر کر رہا تھا، جس کے خواب لیزا بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ لیزا نے کہا کہ اگر وہ کسی روز اچانک غائب ہو جائے، تو مجھے جان لینا چاہیئے کہ وہ اپنا بوریا بستر باندھ کر یمن چلی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ وہاں پر نہ تو کلاسیکی یورپی موسیقی کے کانسرٹ لگتے ہیں اور نہ ہی اوپیرا، تھیٹر اور بیلے ڈانس کے ٹروپ آتے ہیں۔ ڈیٹر فشر ڈیسکاؤ بھی کبھی صنعاء کا رخ نہیں کرتا۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ لیزا یُرگن کا خیال اپنے خوبصورت سر میں سے نکال پھینکے اور جمنازم میں بچوں کو جرمن ادبیات اور جغرافیہ کا درس دیتی رہے۔ دور کے ڈھول سہانے ضرور ہوتے ہیں، مگر سچ مچ خوش آئند وہ کم ہی ثابت ہوتے ہیں۔

مجھے پتہ تھا کہ وہ میری بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکال دے گی اور اس کا اگلا سفر اسے پھر یمن لے جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا اور وہ پہلے سے زیادہ یُرگن کی قائل ہو کر لوٹی۔ اس سال کرسمس کے سرکلر میں اس نے اپنے دوستوں کو یُرگن کے بارہ میں بتایا اور اس کا تعارف اپنے منگیتر کے طور پر کرایا۔ لیزا نے لکھا کہ وہ بہت جلد اولڈ جرمنی کو خیر باد کہہ کر اپنے خیمے صنعاء میں لگانے کا منصوبہ بنا رہی ہے، جہاں پر وہ اپنے دوستوں کا استقبال کھلے دل کے ساتھ کرے گی۔

اس کے بعد دو تین سالوں تک ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی رک گیا اور میں نے یہ گمان کر لیا کہ لیزا یمن چلی گئی ہو گی۔ اس دوران میں اس کا سالانہ سرکلر بھی موصول نہ ہوا، جس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ اس کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ یوں بھی یمن جیسے دور دراز ملک سے کون اپنے ڈھیر بھر دوستوں کو خط لکھتا پھرے، جو اپنے کسی سفر سے ایک آدھ ویو کارڈ بھیج کر اپنے فرض

سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

ایک روز اچانک لیزا کا کارڈ ملا، جس پر اس کا نیا ٹیلی فون نمبر اور نیا پتہ درج تھا، جو بون شہر کا تھا۔ اس کے نیچے اس نے لکھا تھا کہ چونکہ میرا بون آنا جانا رہتا ہے، اس لئے ہمیں ملنے میں آسانی رہے گی۔ کیا لیزا یمن سے لوٹ آئی تھی یا شاید گئی ہی نہیں تھی۔ میں نے جلد از جلد اس سے ملنے کا فیصلہ کیا، جس کا موقعہ تھوڑے دنوں میں پیدا ہو گیا۔

لیزا نے حسب معمول میرا استقبال ریلوے اسٹیشن پر کیا اور مجھے اپنے گھر لے گئی۔ پتہ چلا کہ یُرگن یمن کو خیر باد کہہ کر کومورو جزیروں میں چلا گیا تھا، جہاں پر اس کو بہتر کاروبار ملنے کی توقع تھی۔ لیزا دو بار اس کے پاس یمن جا کر رہی تھی، مگر جرمنی سے نقل مکانی کی نوبت نہ آئی تھی۔ یُرگن کا کہنا تھا کہ جب تک اس کی کاروباری پوزیشن بہتر نہیں ہوتی، وہ شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کومورو میں اس کو ٹورسٹوں کے علاوہ مریضوں کی ٹرانسپورٹ کا کام بھی مل گیا تھا، جس کے لئے اس نے ایک فرانسیسی نرس کو ملازم رکھ لیا تھا۔ جب آخری بار لیزا نے یُرگن کو لکھا کہ وہ گرمیوں میں کومورو آنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو اس نے اسے روکنا چاہا۔ لیزا کا خیال تھا کہ اس کے پیچھے نرس کا ہاتھ تھا۔ اسے واقف کاروں نے بتایا تھا کہ یُرگن نرس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیزا اتنی آسانی کے ساتھ اپنی شکست کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی، اس لئے چپکے سے کومورو جا نکلی۔ یُرگن کو اس بات پر اعتراض پیدا ہوا، مگر اس کی نرس میشل نے لیزا کا استقبال بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ اس نے لیزا کو بتایا کہ وہ حمل سے ہے اور بہت جلد یُرگن کے بچے کو جنم دے گی۔ تھوڑے عرصے کے بعد یُرگن اور میشل نے شادی کر لی، جس کے نتیجے میں لیزا کی زندگی کی پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے، تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ یہی بات لیزا کے ساتھ ہوئی۔ وہ کومورو سے لوٹی، تو محکمہ تعلیم کی طرف سے اس کے بون میں تبادلہ کا پروانہ آیا پڑا تھا۔ بون میں اس کا دوست گونتھر مقیم تھا، جس نے اسے اپنے فلیٹ میں آکر رہنے کی دعوت دی۔ وہ ایک کشادہ فلیٹ میں اکیلا

رہ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس فلیٹ میں اگر کسی چیز کی کمی ہے، تو ایک عورت کی، جو آکر اسے قابل رہائش بنا سکے۔ لیزا کے الفاظ میں گوتھر ایک پیبا آدمی تھا اور وہ اسے بہت پسند کرتی تھی، مگر اس میں شوہروں والی کوئی خوبی نہیں پائی جاتی۔ اس نے اپنی زندگی شروع سے چھڑے چھانٹ بسر کی تھی، اس لئے کسی کے ساتھ مل کر رہنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ خوش قسمتی سے لیزا کو دور نہیں جانا پڑا اور اسی مکان کا اوپر والا فلیٹ خالی ہو گیا اور اسے مل گیا۔ اس طرح دونوں کی آزادی بھی برقرار رہی اور لیزا کو روزمرہ کے لئے ایک ساتھی بھی میسر آگیا۔

آئندہ تین چار سالوں تک لیزا کے ساتھ میرا رابطہ معطل رہا۔ میں نے تصور کر لیا کہ اس نے اپنی زندگی کی لگام کو تھام لیا تھا۔ حالات اچھے ہوں، تو دوست یار ایک دوسرے کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ میں اس دوران میں گاہے بگاہے بون جاتا رہا، مگر لیزا کے ساتھ ملاقات کے لئے وقت نہ نکال سکا۔ دو ایک بار میں نے اس کے گھر پہ فون کیا، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ خدا جانے وہ سارا دن کہاں پر گذارتی تھی۔ اس کی بجائے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ایک روز فرانکفورٹ کے ریلوے اسٹیشن پر گوتھر کے ساتھ ہو گئی۔ جس نے بتایا کہ وہ بون کو خیرباد کہہ چکا تھا اور فرانکفورٹ کے ایک مضافاتی قصبہ میں رہ رہا تھا۔ لیزا کے ساتھ اس کے تعلقات ٹوٹ چکے تھے۔ آخری دنوں میں ان کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ چونکہ میری گاڑی کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا، اس لئے بات کو آگے نہ چلایا جا سکا۔

میں نے واپس آتے ہی لیزا کو خط لکھا اور اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، اگلے ویک اینڈ پہ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ گوتھر کے چلے جانے کا اسے رنج تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ بقول اس کے وہ ماتمی لباس پہن کے پھرتی ہو۔ ان کی دوستی یونیورسٹی کے زمانہ سے تھی اور شاید بدستور قائم ہوتی، اگر لیزا کی سہیلی ریناٹے نے اپنا منحوس سایہ اس پر نہ ڈالا ہوتا۔ وہ لیزا کے پاس آکر ٹھہری اور جاتے ہوئے گوتھر کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔ لیزا پھر ایک بار اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ ان دنوں میں اخباروں میں "ضرورت رشتہ" کے کالموں کا مطالعہ کیا کرتی تھی۔ اس نے خود بھی ایک اشتہار چھپوایا تھا، جس کے جواب میں اسے ڈھیروں خطوط ملے تھے۔ اس نے ان میں سے

پندرہ لوگوں کا انتخاب کیا تھا اور ان دنوں میں باری باری ان کا انٹرویو لے رہی تھی' اس نے کہا کہ وہ امیدواروں سے خوب دعوتیں کھا رہی تھی ۔ ابھی اس نے حتمی طور پر کسی کے حق میں فیصلہ نہیں کیا تھا، البتہ دو امیدوار اسے اچھے لگے تھے ، جن کو وہ قریب سے دیکھنا اور ان کا امتحان کرنا چاہتی تھی ۔

اس کے بعد دو ایک سالوں تک مجھے لیزا کی طرف سے کوئی خبر نہ ملی ، جس کے سبب میں نے تصور کر لیا کہ اس کو کوئی ساتھی مل گیا ہو گا ۔ خود میری زندگی پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئی تھی ، حتیٰ کہ مجھے خط و کتابت کے لئے بھی کم ہی وقت ملتا تھا ۔ ایک روز اچانک لیزا کا خط آگیا کہ وہ کوپن ہیگن جاتے ہوئے ہمبرگ سے گذرے گی اور مجھ سے ریلوے اسٹیشن پر ملنا چاہتی ہے ۔

اس کی گاڑی کے ہمبرگ پہنچنے اور کوپن ہیگن جانے والی گاڑی کے چلنے میں تین گھنٹوں کا وقفہ تھا ۔ یہ وقت ہم نے آلسٹر جھیل کے کنارے گذارا ۔ لیزا کا بدن کسی قدر فربہ ہو گیا تھا، مگر اس کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ اس کا چہرہ مونا لیزا سے زیادہ مشابہت اختیار کر گیا تھا ۔ میں نے اس کی خاموشی کا سبب جاننا چاہا ۔ اس نے جواب دیا کہ لکھنے یا سنانے کو کچھ ہوتا، تو وہ ضرور رابطہ کرتی ۔ میں نے ان دو امیدواروں کے بارے میں پوچھا، جن کا امتحان ہماری آخری ملاقات کے وقت ابھی ہونے والا تھا ۔ لیزا نے کہا کہ ان میں سے ایک مالیخولیا کا مریض نکلا اور دوسرا یوں تو میڈیکل ڈاکٹر تھا، مگر اس کا اصل پیشہ اکیلی دکیلی عورتوں کا دل بہلانا تھا ۔ اس بات کا پتہ اسے بعد میں جا کر چلا، جب کہ وہ دونوں کانوں تک اس کی محبت میں کھب چکی تھی ۔ لیزا نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ اس کی ازلی و ابدی محبت یرگن کے لئے مختص ہے ۔ اس کو وہ ساری عمر نہ بھلا سکے گی ۔ اس دوران میں وہ دو بار کومورو جا چکی تھی' مگر یرگن کی طرف سے گرم جوشی کا اظہار نہ ہوتا تھا ۔ پھر بھی وہ اس کا انتظار آخری سانس تک کرے گی ۔

اس ملاقات کے بعد ہمارا رابطہ پھر ایک بار ٹوٹ گیا ۔ اس طرح کئی سال گذر گئے اور میں نے لیزا کا شمار ان لوگوں میں کر لیا، جن کے ساتھ انسان کی ملاقات زندگی کے کسی موڑ پر ہوتی ہے اور کچھ دیر تک اکٹھے چلنے کے بعد راستے جدا ہو جاتے

ہیں ۔

اتفاق سے ایک روز لیزا نے مجھے ٹیلی ویژن کی ایک ٹاک شو میں دیکھا اور فون پر مجھے بون آنے کی دعوت دی ۔ میں نے گذشتہ سالوں میں اس کی خاموشی کا سبب جاننا چاہا ، تو وہ ٹال گئی ۔ اس نے کہا کہ اس بات کا جواب وہ ملاقات ہونے پر دے گی ، جس کے لئے مجھے بہت سا وقت ساتھ لانا چاہیئے ۔

وہ بدستور اپنے پرانے فلیٹ میں مقیم تھی ۔ مجھے یہ جاننے کا شوق تھا کہ ہماری آخری ملاقات کے بعد زندگی نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ۔ لیزا نے کہا کہ زندگی اس کے ساتھ ہمیشہ سے مذاق کرتی آئی تھی ۔ ایک زمانے میں اس کے دوستوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ سب کو فرداً فرداً خط نہ لکھ سکتی تھی ، اس لئے سرکلر بھیجا کرتی تھی ۔ ہر مہینے کوئی نہ کوئی دوست اس کو ملنے کے لئے آتا تھا اور وہ دنیا جہان کے ملکوں کی سیر ان کی معیت میں کرتی تھی ۔ آہستہ آہستہ سب ٹھکانے لگ گئے اور وہ اکیلی رہ گئی ۔ اس میں یُرگن کا بھی قصور تھا ، جس کے ساتھ اس کا زندگی گذارنے کا خواب حقیقت نہ بن سکا تھا ۔ اپنے اکلاپے سے بچنے کے لئے اس نے تمام حیلے کر دیکھے اور کئی ایک چرکے کھائے ۔ دھوکہ بازی کا شکار بنی ، بلکہ ایک دفعہ اس کو اپنی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے ۔ اس کا ایک دوست مالیخولیا کا مریض نکلا ، جس کی نظر میں ساری دنیا اس کی جان کی تاک میں تھی ۔ اس سے بہت مشکل سے نجات ملی ۔ پھر لیزا کو اپنی زندگی بے مقصد لگنے لگی اور اس نے خودکشی کر لینے کی ٹھان لی ۔ لمبی چوڑی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کی بدقسمتی کا آغاز یُرگن کی ذات سے ہوا تھا ۔ اس لئے اگر یُرگن اس کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں ہے ، تو پھر اسے اس کے ساتھ مرنا ہوگا ۔

لیزا کو مورو پہنچی ، تو یُرگن اور میشل کے ساتھ ان کی آٹھ سالہ بیٹی مانویلا نے جوش و خروش کے ساتھ اس کا استقبال کیا ۔ دوسرے تیسرے روز یُرگن نے لیزا سے کہا کہ اسے اور میشل کو ایک خیال بہت ستا رہا ہے ۔ وہ چونکہ اکٹھے پرواز کرتے ہیں ، اس لئے اگر انہیں کوئی حادثہ پیش آگیا ، تو مانویلا کی دیکھ بھال اور پرورش کون کرے گا ۔ یُرگن اور میشل دونوں کا کوئی آگا پیچھا نہیں تھا ۔ دونوں کے والدین مر چکے

تھے اور کوئی دوسرا نزدیکی رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بعد مانویلا یتیم خانوں میں دھکے کھائے۔ اس لئے انہوں نے سوچا تھا کہ اگر لیزا اس صورت حال میں مانویلا کی کفالت کا ذمہ اٹھالے، تو وہ اس طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ لیزا نے ہامی بھرلی۔ البتہ اس نے دل میں طے کر لیا کہ اب اس کے ساتھ صرف یُرگن کو ہی نہیں، میشل اور مانویلا کو بھی مرنا ہوگا۔

لیزا کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔ یُرگن نے اسے یمن میں ایک بار اپنے جہاز کی اوور ہالنگ کرتے ہوئے ایک پرزہ دکھایا تھا، جس کو ڈھیلا کر دیا جائے، تو انجن ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جام ہو جاتا ہے اور جہاز کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔

اتوار کے روز پکنک منانے کا پروگرام بنایا گیا۔ جس کے لئے ایک ایسے جزیرے کا انتخاب کیا گیا، جو دو گھنٹوں کی پرواز کے فاصلے پر واقع تھا۔ یُرگن نے اپنے معمول کے مطابق ہفتے کے روز انجن کی اوور ہالنگ کی، جس میں لیزا نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ جب درمیان میں ایک دفعہ یُرگن کو ٹیلی فون پر بات کرنے کے لئے آفس میں بلایا گیا، تو لیزا نے اس کی عدم موجودگی میں اس پرزے کو ڈھیلا کر دیا۔ وہ رات لیزا پر بہت بھاری تھی، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اگلے روز اس کی اور یُرگن کے خاندان کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ تینوں بہت دیر تک باہر باغیچے میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ یُرگن اپنے یمن کے قیام کے دنوں کے قصے سناتا رہا، جہاں پر اس کو ایک دفعہ قبائیلیوں نے اغوا کر لیا تھا۔ مگر جب ان کو پتہ چلا کہ وہ پائلٹ ہے، تو انہوں نے اسے معاوضہ وصول کرنے کے بغیر رہا کر دیا تھا۔

اگلی صبح لیزا کی آنکھ کھلی، تو یُرگن اور میشل غائب تھے۔ انہوں نے اس کے نام کچن کی میز پر ایک نوٹ چھوڑا تھا کہ انہیں رات کے دوران ایمرجنسی کے تحت ایک مریض کو ہسپتال میں پہنچانے کے لئے کہا گیا تھا۔ جانے اور آنے میں پانچ چھ گھنٹے لگ جائیں گے۔ انہیں امید تھی کہ وہ دوپہر تک واپس آجائیں گے۔ لیزا کو پتہ تھا کہ وہ دوپہر اب کبھی نہیں آئے گی۔ اتنے میں ہوائی اڈے کا ایک افسر یہ بتانے کے لئے آگیا کہ یُرگن کے جہاز کو راستے میں ایک حادثہ پیش آگیا تھا اور وہ کریش ہو گیا تھا۔ ہوائی اڈے کی طرف سے بھیجی جانے والی کمک پارٹی جہاز کو تلاش کرنے

میں کامیاب ہو گئی تھی ۔ مگر جہاز میں سوار تینوں افراد ہلاک ہو چکے تھے ۔

لیزا نے کہا کہ وہ اس لمحے سخت کش مکش میں تھی ۔ ایک طرف اسے احساس تھا کہ حادثہ کی ذمہ داری اس پر پڑتی تھی اور اسے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیئے ۔ دوسری طرف اسے یُرگن اور میشل سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا کہ وہ ان کے مرنے پر مانویلا کی پرورش کا بوجھ اٹھائے گی ۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے ۔ بالآخر اس نے سفارت خانہ کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرنے کا ارادہ کیا، سفیر نے فون پر کہا کہ وہ خود اس کے پاس آرہا ہے ، کیونکہ کومورو کی پولیس کی طرف سے اس کو رپورٹ پہنچ چکی تھی کہ وہ حادثہ دراصل قتل کا کیس تھا ۔

جب لیزا نے سفیر کو بتایا کہ اس نے جہاز کا ایک پرزہ ڈھیلا کر دیا تھا ، جس کے نتیجہ میں جہاز کو ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد گر جانا چاہیئے ، تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اس نے کہا کہ حادثہ پہلے آدھ گھنٹے کے اندر وقوع میں آیا تھا اور یُرگن کی پشت میں ایک چھ انچ لمبا چاقو پیوست پایا گیا تھا ۔ یُرگن پر حملہ اس مریض نے کیا تھا ، جو اس کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور جسے وہ اس کی مرضی کے خلاف ہسپتال میں پہنچانے کے لئے لے جا رہے تھے ۔

لیزا مانویلا کو اپنے ساتھ جرمنی لے آئی تھی ۔ وہ یُرگن اور میشل کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرنے کے بارہ میں سنجیدہ تھی ۔ ہم ابھی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ۔ لیزا نے اسے بازوؤں میں تھام کر چوم لیا ۔ میں جان گیا کہ لیزا یُرگن کی بیٹی کی ماں بن چکی تھی اور اس کے اکلاپے کا مداوا ہو چکا تھا ۔

(کمر فیلڈ (جرمنی) ۔ ۸ فروری ۱۹۹۷ء)

زندہ گردہ

وہ ہماری میز کا چوتھا آدمی تھا اور پہلی بار شام کے کھانے پہ ڈائیننگ ہال میں آیا تھا۔ کلینک کے رواج کے مطابق بٹلر اسے اس کی مقررہ سیٹ پر چھوڑنے کے لئے ساتھ آیا تھا اور ہمارے ساتھ اس کا تعارف کرا کے گیا تھا۔ مگر اس کا نام قدرے نامانوس ہونے کی وجہ سے میرے پلے نہیں پڑا تھا یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا، جو بندر کے چوتڑوں کی طرح لال سرخ تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے کان کی لووں سے کسی بھی لمحے خون ٹپکنے لگے گا۔ اس کا پیٹ ساتویں ماہ کی حاملہ کی طرح نکلا ہوا تھا۔ میں نے جان لیا کہ وہ شخص سچ مچ بیمار تھا۔

میرے دائیں ہاتھ پر فرنز کی سیٹ تھی۔ وہ سنا رہا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد کوہ پیمائی کے لئے نکل گیا تھا اور پورے پانچ گھنٹوں تک گھوم پھر کے لوٹا تھا۔ اس نے تین ہفتوں میں تیسری بار وینڈل اشٹائن چوٹی کو سر کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جو شخص ایسے اتھلیٹک کارنامے سرانجام دے سکتا ہے اسے بھلا کیا بیماری ہو سکتی ہے۔ میں نے گھوم کر اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس کی آنکھوں سے سرخوشی کے فاتحانہ لپکے نکلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ مگر وہ اتنی گہرائی میں گڑھی ہوئی تھیں کہ میں ان کی تہہ تک نہ پہنچ پایا۔ تب میں جان گیا کہ وہ شخص خوشی منانے یا ماتم کرنے کے قابل نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بیمار نہ ہو، مگر تندرست وہ بہر صورت نہ تھا۔

فرنز کے بالمقابل میز کے دوسرے طرف ایروین بیٹھا ہوا کچھ ایسی ڈھٹائی کے ساتھ مسکرا رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو کہ آج کل کون پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ اس کا چہرہ

گھنٹوں تک دھوپ میں پڑے رہنے کے سبب جھلسا ہوا تھا۔ میں نے گمان کیا کہ وہ شاید وہاں پر تعطیلات گذار رہا تھا، جن کے خاتمے پر جرمن اپنے سنگیوں کو براؤن چمڑی دکھا کر رشک و حسد کی آگ میں جلایا کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ سارا دن دھوپ سینکتا رہا ہے اور کسی ریچھ کی طرح بھوکا ہے۔ اس نے ویٹرس سے کہا کہ وہ مینیو کا پہلا اور دوسرا کھانا کھانا چاہتا ہے اور تیسرے کھانے کی سویٹ ڈش۔ اس سے میں جان گیا کہ اسے کوئی بیماری لاحق نہ تھی۔

ہماری میز کا چوتھا آدمی میرے بالمقابل والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کسی بل ڈاگ سے ملتا جلتا تھا۔ اور مجھے پورا پورا یقین تھا کہ وہ بھی ایروین کی طرح دو تین کھانے آسانی کے ساتھ ہڑپ کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے کلینک میں قیام کے دوران کھانے کی راشن بندی کر دی تھی۔ سوپ اور سویٹ ڈش کی اس کو قطعی ممانعت تھی۔ اور پرہیزی کھانا، جو اس کے لئے خاص طور پر لایا گیا تھا، اس کی مقدار میرے کھانے سے نصف تھی۔ ہم نے ترحم کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم تینوں میں سے کوئی کچھ کہتا، اس نے خود ہی کہا کہ ڈاکٹر اس کو بھوکوں مارنے کے درپے ہے۔ اور یہ کہ وہ اس چیز سے خوب واقف ہے۔ آخر وہ پانچویں بار بحالیٔ صحت کی کلینک میں داخل ہوا ہے۔ ایروین نے بتایا کہ وہ تیسری بار آیا ہے۔ فرٹز نے کچھ نہ کہا۔ وہ کھانے میں جتا ہوا تھا۔

میرے لئے کلینک میں داخل ہونے کا وہ پہلا موقعہ تھا۔ در حقیقت میرے وہاں پر ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ میں بالکل بیمار نہ تھا۔ رہا ریڑھ کی ہڈی کا درد، تو اس پر چار ماہ ہو چلے تھے اور میں اسے بھول چکا تھا۔ البتہ مجھے کمر درد عین ان دنوں میں اٹھا تھا، جب ہم آسٹریا کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔ ہمارا ارادہ کار میں سفر کرنے کا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ مجھ سے پورا دن کار نہ چلائی جائے گی۔ ڈاکٹر بینگرٹ نے دو ٹیکے لگائے تھے اور گولیاں کھانے کو دی تھیں۔ ہفتہ بھر مجھے روزانہ بجلی کی ٹکور کے لئے جانا پڑا تھا۔ ان حالات میں میں نے بحالیٔ صحت کی کلینک میں داخل ہونے کی تجویز کو مان لیا تھا۔ مگر دل ہی دل میں سوچا تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

جب ہم ایک ماہ کے بعد سفر سے واپس لوٹے، تو کلینک کی چٹھی آئی پڑی تھی جس میں لکھا تھا کہ میرے لئے وسط ستمبر سے وسط اکتوبر تک کے لئے ایک کمرہ ریزرو کر دیا گیا ہے۔ اگر میں ان تاریخوں کو نہیں آسکتا، تو مجھے فوراً اس امر کی اطلاع بھیج دینی چاہیئے، تاکہ کسی دوسرے مریض کو میری جگہ پر لیا جاسکے۔ پتہ چلا کہ ہزاروں انسان بحالیٔ صحت کی کلینک میں داخلہ حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ مجھے ہیلتھ انشورنس کے نمائندہ نے کہا کہ ایسا موقعہ روز روز نہیں ملا کرتا۔ اس لئے مجھے ایک دن بھی انتظار کرنے کے بغیر کلینک کی آفر کو قبول کر لینا چاہیئے۔

میری توقع کے برعکس کلینک ایک اونچے درجہ کے لگژری ہوٹل سے ملتی جلتی تھی۔ وہاں پر سرے سے ہسپتال کا کوئی ماحول نہ پایا جاتا تھا۔ دوائیوں کی بو باس بالکل موجود نہ تھی۔ دراصل بیماروں کو وہاں پر داخل ہی نہیں کیا جاتا۔ البتہ ڈاکٹروں کی ایک پوری کھیپ موجود تھی، جن کا کام عام دیکھ بھال کرنا اور مریضوں کی صحت کو بحال کرنے کے لئے صلاح و مشورہ دینا تھا۔ ایمرجنسی کی صورت میں وہ لوگ فرسٹ ایڈ تو دے سکتے تھے، مگر علاج معالجہ کا انتظام ایک قریبی ہسپتال میں تھا۔ پریوں کی ڈاریں ہر طرف اڑتی پھرتی تھیں، جو نرسیں کم اور گیشائیں زیادہ لگتی تھیں، ان کی موجودگی نے کلینک کے ماحول میں ایک نوع کی دلربائیت پیدا کر دی تھی۔

میرا استقبال جس پری نے کیا، اس کا نام ارُسلا تھا۔ اس نے میرا سامان پورٹر کے سپرد کیا اور خود مجھے کلینک دکھانے کے لئے چل دی۔ میں رات کی گاڑی سے سفر کر کے صبح سویرے وہاں پر پہنچا تھا اور نئی کھیپ کا پہلا مریض تھا۔ ہر بدھ کے روز مریضوں کا ایک چوتھائی حصہ اپنے چار ہفتے پورے کر کے رخصت لیتا ہے۔ اور اتنی ہی تعداد میں نئے مریض کلینک میں داخلہ کی خاطر آتے ہیں۔ جانے والوں کو الوداع اور آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے پریاں داخلے کے ہال میں جمع تھیں، مگر ارسلا مجھے ان سب سے الگ تھلگ لگی، جیسے وہ کسی اور جزیرے کی مخلوق تھی۔ اس کا قد میانہ تھا اور جسم بھرا بھرا۔ مگر اتنا بھی نہیں کہ اسے موٹاپا کہا جاسکے۔ بس اتنا متناسب، جتنا ایک خوبصورت عورت کا جسم ہونا چاہیئے۔ اس کا ناک نقشہ بے حد ہنر مندی سے تراشا گیا تھا، جس کو ہلکے میک اپ نے مزید نکھار بخش دیا تھا۔

اس کے لب و لہجہ نے میرے دل میں باربرا کی یاد تازہ کرا دی، جو اس کی طرح جنوبی جرمنی کی رہنے والی تھی۔ اس کے فقروں کی بناوٹ اور طرز ادا میں وہی دلفریبی پائی جاتی تھی۔

میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا، جہاں سے انسان دور تک دیکھ سکتا تھا۔ باغ کی جانب کی دیوار شیشے کی تھی، جس کے آگے خاصی کشادہ بالکنی تھی۔ مگر بالکنی میں بیٹھنے کا موسم گذر چکا تھا۔ تاہم دھوپ نکلے اور سرد ہوا نہ چل رہی ہو، تو انسان دیر تک وہاں پر بیٹھ کر لکھ پڑھ سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ بہت سی کتابیں لایا تھا، جن کو پڑھنے کی خواہش ایک عرصہ سے میرے دل میں مچل رہی تھی۔ خیال تھا کہ شاید کچھ لکھ پڑھ سکوں گا۔ ایک دو افسانے میرے ذہن میں پل رہے تھے۔ مگر اس وقت تک مجھے پتہ نہ تھا کہ میرا سارا پروگرام ہماری میز کے چوتھے آدمی کے سبب دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ میں نے آپ کو اس کا نام تو ابھی تک بتایا ہی نہیں۔ دراصل وہ اتنا اوپرا ہے کہ مجھے اب بھی اس کو یاد کرنے کے لئے ذہن پر بوجھ ڈالنا پڑ رہا ہے۔ اس کا نام کلیمنز مسائیکا تھا، جو شاید جرمنی بھر میں ڈھونڈے سے دوسری بار نہ مل سکے۔

ہاں تو یہ کلیمنز مجھے شام کے کھانے کے بعد کلینک سے کافی دور گاؤں میں مل گیا، جہاں پر وہ میری طرح چہل قدمی کے لئے گھوم پھر رہا تھا۔ اس نے کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی طرح میرا استقبال کیا، حالانکہ آدھ پون گھنٹہ قبل ہم کھانے کی میز پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور فقرے بازی سے ایک دوسرے کو محظوظ کر رہے تھے، جس کا مقصد دراصل ایک دوسرے کا حدود اربعہ معلوم کرنا اور یہ جاننا تھا کہ کون کیا ہے، کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔ جرمنی میں لوگ کھٹ سے ایک دوسرے سے اپنا تعارف نہیں کرا دیتے اور نہ ہی اپنے پیشہ یا اپنی بیک گراونڈ کے بارہ میں کچھ بتاتے ہیں۔ یہ تفصیلات آدمی کو بڑی محنت اور ہوشیار مندی کے ساتھ پور پور جمع کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں جا کر دنوں یا ہفتوں میں مکمل تصویر بنتی ہے۔ اور بعض اوقات نہیں بن پاتی یا غلط بنتی ہے۔

میں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے "کلینکی سائے" کے بغیر اکیلا گردش

کر رہا ہے۔ عام طور سے ایسی کلینکوں میں مرد اور عورتیں اپنے لئے ایک جوڑا تلاش کر لیتے ہیں، جن کو مزاحاً "کلینکی سایہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے جواباً میرے "کلینکی سائے" کے بارے میں پوچھا۔ آخر میں بھی تو اکیلا سڑکیں ناپ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے اپنے سائز کا کوئی سایہ نظر نہیں آیا، جس کے ساتھ میں چل سکتا۔ جملہ محترمات اتنی پکی عمر کی ہیں کہ آدمی ان کے ساتھ کچی باتیں نہیں کر سکتا۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ پھر اس نے کہا کہ ایسا بھی حشر نہیں ہے۔ وہ مجھے صبح ناشتے کے وقت ایک خاتون دکھائے گا، جس کی دیکھ کر میں کلینک کی پریوں کو بھول جاؤں گا۔

کلیمنز خاصا زندہ دل آدمی تھا۔ وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی لطیف پہلو نکال لیتا تھا۔ پھر اس پر دل کھول کر ہنستا تھا۔ کلینک کی پریوں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ ہیلتھ کلینک کا سب سے زیادہ کارگر خفیہ ہتھیار ہیں، جن کو دیکھ کر آدمی کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اچھے خاصے کرانک مریض بھی اپنی رگوں میں خون کی حرارت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس کا ایک واقف کار کلینک کی ایک پری پر ایسا عاشق ہوا تھا کہ چوتھی بار اسی کلینک میں جا کر داخل ہوا تھا۔ پھر اس نے سنایا کہ وہ نوجوانی کے دنوں میں ایک سیلز گرل پر دل و جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ اور ہر روز اس کی دوکان پر جا کر اس سے جرابوں کا جوڑا خریدا کرتا تھا۔ اور ہر بار اسے گھنٹوں تک عمدہ رنگ اور اچھی کوالٹی کے سلسلہ میں مصروف رکھتا تھا۔ جب مہینہ بھر ہو گیا، تو لڑکی نے کہا کہ اتنی جرابیں خرید کر کیا کرو گے۔ تم مجھے سیدھے سبھاو کیوں نہیں اپنے ساتھ سینما ہاوس چلنے کی دعوت دیتے۔

"تو کیا تم نے اسے دعوت دی"۔

"ضرور دی، مگر آگے چل کر اس سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی، جن کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ہوتی ہے اور جو ہر شخص کو، جس کے ساتھ ان کی راہ چلتے اتفاق سے مٹھ بھیڑ ہو جائے، رجسٹرار نکاح کے دفتر میں گھسیٹ کر لے جانے سے بھی نہیں چوکتیں۔ جب کہ میں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ میں ہر دوسری عمارت میں داخل ہوں گا، مگر رجسٹرار نکاح کے دفتر میں کبھی قدم نہیں رکھوں گا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے کن حیلوں بہانوں سے اپنی جان

چھڑانی پڑی تھی"۔

"اچھا اب بات میرے پلے پڑی ہے۔ تمہیں عورتوں سے ڈر لگتا ہے کہ وہ کہیں مستقلاً گلے نہ پڑ جائیں"۔

"اگر انسان کو دودھ پینے کی خواہش ہو، تو کیا ضروری ہے کہ آدمی اس کے لئے گائے کو اپنے دروازے پر باندھ لے"۔

میں نے کہا کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ بات صرف دودھ پینے کی ہے۔ اگر ایسا ہوتا، تو میری سمجھ میں آجاتی۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ گائے خود آ کر دودھ دوہنے کی فرمائش بھی کیا کرے۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے لئے ڈائیننگ ہال میں ملے، تو اس نے مجھے ایک محترمہ کی طرف متوجہ کیا، جس کا ناک نقشہ خاصا دلفریب تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ پہلے روز میری نظر میں آنے سے کیسے بچ گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس سے تعارف کیسے ہو۔ کلیمنز نے کہا کہ یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو، مجھے بہت سے آزمودہ نسخے یاد ہیں۔ صبح جمناسٹک کے دوران اس نے اندازہ لگایا تھا کہ محترمہ کو کھلاڑی ہونا چاہیئے۔ کلینک میں ٹیبل ٹینس اور لان ٹینس کا انتظام موجود تھا۔ اس نے کہا کہ ہم لان ٹینس کی ٹیم بناتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کا ایک پرچہ نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا کہ دو مرد کھلاڑیوں کو ڈبل ٹینس کے لئے پارٹنر کی ضرورت ہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت وہ محترمہ بنفس نفیس ہماری میز پر یہ بتانے کے لئے آئی کہ وہ ہمارے ساتھ لان ٹینس کھیلنے کی خواہش مند ہے۔ کلیمنز نے پوچھا کہ وہ نئی کھلاڑی ہے یا پرانی۔ اس نے کہا درمیانی۔ چار بجے کا وقت لان پر ملنے کے لئے طے ہوا۔ ریکٹ اور بال کلینک سے کرایہ پر لئے جا سکتے تھے۔ اس کے جانے کے بعد کلیمنز نے کہا کہ اسے محترمہ کی آنکھوں میں وہ چمک دکھائی نہیں دی، جس کا ذکر ہم کل شام کر رہے تھے۔ پھر اس نے اضافہ کیا کہ وہ چمک عورت کی آنکھوں میں نہ ہو، تو معاملہ پھیکا سا رہتا ہے۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک اور عورت یہ پوچھنے کے لئے آگئی کہ کیا ہماری ٹیم مکمل ہو گئی ہے یا ابھی جگہ باقی ہے۔ کلیمنز نے کہا کہ بس آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کلیمنز کو وہ چمک نظر آ گئی اور اس نے کہا کہ اب معاملہ

ٹھیک ہے ۔ اس کا نام میثائیلہ تھا ۔ کلیمنز نے اس کے جانے کے بعد بتایا کہ یہی نام اس کی چھوٹی بہن کا تھا ، جو دوسری عالمگیر جنگ میں اپنے خاندان سے بچھڑ گئی تھی ۔ اس کے بارہ میں انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں ۔ اور اگر زندہ ہے ، تو کہاں پر ، ہوتی ہے ۔

جرمنی میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران بچوں کو شہروں پر متوقع بمباری سے بچانے کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ ان کو دیہاتی علاقوں میں بھیج دیا گیا تھا ، جہاں پر ان کو زمیندار فیملیوں کے پاس رکھا گیا تھا ۔ ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا تا کہ والدین کا بچوں کے ساتھ رابطہ رہے ۔ بعض صورتوں میں یہ ممکن نہ ہو سکا ، کیونکہ والدین بمباری کی نذر ہو گئے یا انہیں اپنے شہروں سے ہجرت کرنی پڑی ۔ کلیمنز نے بتایا کہ اس کی بہن میثائیلہ بہت چھوٹی تھی ، جب اس کو اور دوسرے بہن بھائیوں کو اس انتظام کے تحت دیہاتی علاقہ میں بھجوایا گیا ۔ چنداں بعد ان کا آبائی شہر ، جو شلیزیا میں تھا ، روسی فوجوں کے قبضہ میں آگیا اور اس کے والدین کو جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگنا پڑا ۔ جنگ کے خاتمہ پر سات میں سے چھ بچوں کے ساتھ رابطہ ہو سکا اور والدین انہیں اپنے پاس لے آئے ۔ مگر سب سے چھوٹی بیٹی میثائیلہ کا کوئی اتا پتا نہ لگ سکا ۔ چونکہ ان کا آبائی شہر پولینڈ کے تحت آچکا تھا اور تمام بلدیاتی کاغذات آگ کی نذر ہو گئے تھے ، اس لئے یہ معلوم کرنا ممکن نہ رہا کہ میثائیلہ کو کس فیملی کے حوالے کیا گیا تھا ۔ کلیمنز کے والدین نے اس بارہ میں بہت کوشش کی اور ریڈ کراس اور دوسرے متعلقہ اداروں کے ذریعہ ڈھونڈا ، مگر سب بے سود تھا ۔ جرمنی میں گمشدہ لوگوں کی تلاش کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ پایا جاتا ہے ، جس کی طرف سے جنگ کے خاتمہ سے پچاس سال بعد آج بھی گمشدہ لوگوں کی فہرستیں شائع کی جاتی ہیں اور ہر روز ریڈیو کی خاص نشریات میں ان کے نام سنائے جاتے ہیں ۔ مگر میثائیلہ اتنی کم عمر میں اپنے خاندان سے بچھڑی تھی کہ اس کو شاید ہی اپنی فیملی کے بارہ میں کچھ یاد ہو گا ۔ کون جانتا ہے کہ اس کو اپنا خاندانی نام اور اپنے آبائی شہر کے بارہ میں کچھ بتایا گیا تھا یا نہیں ۔

جب ہم پچھلے پہر ٹینس کھیلنے کے لئے لان میں اکٹھے ہوئے ، تو پتہ چلا کہ کلیمنز

اپنی بھاری بھرکم توند کے باوجود اچھا خاصا کھلاڑی تھا۔ بہر صورت اس کا کھیل مجھ سے بہتر تھا، جب کہ اس کی پارٹنر میشائیلہ کے مقابلہ میں میری پارٹنر کوزیما ٹینس کی منجھی ہوئی کھلاڑی تھی۔ گویا دونوں ٹیمیں کم و بیش برابر تھیں۔ مگر ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ جب میشائیلہ کو دائیں ہاتھ کی طرف جانے کو کہا جاتا تھا، تو وہ بائیں ہاتھ کی طرف چل دیتی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ سے سمتوں کو گڈمڈ کرتی آئی تھی۔ کوزیما نے کہا کہ یہ بات اس چیز کی علامت ہے کہ میشائیلہ پیدائشی طور پر کھبی ہے، مگر بعد میں اس کو دائیاں ہاتھ استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ کوزیما سائیکالوجسٹ ہے۔ میشائیلہ نے اس امر کی تصدیق کی کہ اس کو دائیاں ہاتھ استعمال کرنا زبردستی سکھایا گیا تھا، جب کہ فطرتی طور پر اس کا رجحان بائیں ہاتھ کی طرف تھا۔ کلیمنز نے بتایا کہ اس کی چھوٹی بہن میشائیلہ بھی کھبی تھی۔ مگر اس کے خاندان میں یہ چیز بری نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کا باپ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتا تھا کہ اس کے سات بچوں میں سے ایک بیٹی اس کی طرح کھبی تھی۔ میشائیلہ نے اس کے الٹ اپنے اوپر کی جانے والی سختی کی ایک لمبی داستان سنائی۔ جب وہ چھوٹی تھی اور مہمان گھر میں آتے تھے اور اس کو مصافحہ کرنا ہوتا تھا، تو وہ فطرتی طور پر بایاں ہاتھ آگے کرتی تھی۔ اس پر اس کی ماں فوراً ٹوک دیتی تھی اور کہتی تھی کہ اپنا اچھا والا ہاتھ مصافحہ کے لئے دو۔ جب اس کو اسکول میں لکھنا سکھایا گیا، تو اس کی خواہش ہوتی تھی کہ قلم کو بائیں ہاتھ میں پکڑے، مگر استانی اس سے منع کرتی تھی اور اس کو دائیں ہاتھ سے لکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی لکھائی اپنی کلاس میں سب سے کلوہڑی تھی۔

شام کے کھانے کے بعد جب ہم کلینک کی بار میں مل بیٹھے، تو بات کوزیما کے پیشہ سے شروع ہو کر خوابوں تک پہنچ گئی۔ کوزیما نے کہا کہ خوابیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ وہ اس سچائی کو بھی آشکار کر دیتی ہیں، جس کا سامنا ہم جاگتے ہوئے نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے ہم بیشتر اوقات خوابوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ جب کہ در حقیقت وہ ہمارے اندر کی آواز ہوتی ہیں، جہاں پر سارا مواد جمع ہوتا اور جوشاندے کی طرح پکتا رہتا ہے۔ میشائیلہ نے کہا کہ ایک خواب سالوں سے

اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ اسے خدا جانے کتنی بار دیکھ چکی ہے۔ خواب میں وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے اور اس کو ایک مکان دکھائی دیتا ہے، جس کے پچھواڑے میں ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا ہے۔ اس کے پاس مرغیوں کا ایک ڈربہ ہے اور ایک جنگلے میں خرگوش بند ہیں۔ مکان کے ساتھ ملی ہوئی ایک دوکان ہے، جس پر کچھ لکھا ہوا ہے، مگر وہ اس کو نہیں پڑھ سکتی۔ وہ اس دوکان میں جانا چاہتی ہے اور ایک بوڑھے آدمی کو کتابوں کی جلد بندی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہے، مگر اس کو روک دیا جاتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت، جس کے بال برف کی طرح سفید ہیں، اس کو ہاتھ سے پکڑ کر گھر کی طرف لے جاتی ہے، جہاں پر بہت سے بچے کھیل رہے ہیں۔ عورت اس کو ایک کاغذ دیتی ہے اور ہانس کی طرف بھیجتی ہے تاکہ وہ اس کو ایک کشتی بنا دے۔ وہ وعدہ کرتی ہے کہ وہ دونوں شام کو دریا پر جا کر کشتی کو پانی میں ڈالیں گے۔ یہاں پر پہنچ کر خواب ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے بالکل پتہ نہیں ہے کہ وہ بڑھیا کون ہے اور ہانس کس کا نام ہے۔ میشائیلہ نے کہا کہ وہ شروع سے جلد ساز بننا چاہتی تھی۔ اور جونہی اس کو گاؤں سے نکل کر شہر میں پہنچنے کا موقعہ ملا، وہ ایک بک بائینڈنگ شاپ میں جا کر اپرنٹس بن گئی۔ تین سالہ ٹریننگ کے بعد اس کو اسی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ جب اس کے ماں باپ مر گئے، تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ گاؤں میں اپنا آبائی مکان اور زراعتی رقبہ بیچ دیا اور اس سرمایہ سے جلد سازی کی ایک دوکان کھول لی، جس کو وہ بدستور چلا رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کا آبائی گاؤں کلینک سے اندازاً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اگر ہمیں شوق ہو، تو وہ ہمیں اپنا گاؤں دکھانے کے لئے لے جائے گی۔

کلیمنز کی کار میں ہم اس سے اگلے روز گاؤں کو دیکھنے کے لئے گئے۔ میشائیلہ کے والدین کا مکان، جس کا فروخت کے وقت خستہ حالت میں ہونا بتایا گیا تھا، مرمت کے بعد چمک رہا تھا۔ ہمارا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا گیا اور ہمیں گھر کے سارے کمرے دکھائے گئے۔ وہاں سے اٹھ کر ہم چرچ میں گئے، جس کے بوڑھے پادری نے میشائیلہ کو پہچان لیا اور بتایا کہ اس نے ہی اس کو بپتسمہ دیا تھا۔ اس کے والدین کی اس نے تعریف کی اور کہا کہ وہ بہت خدا ترس لوگ تھے۔ دونوں چرچ کے

قبرستان میں مدفون ہیں ۔ میشائیلہ نے ہمیں ان کی قبریں دکھائیں اور کہا کہ ان کی تصویر گاؤں کے پب میں لگی ہوئی ہے ۔ اگر وہ اس وقت کھلا ہوا، تو ہم وہاں پر گھڑی دو گھڑی جا کر بیٹھیں گے ۔ شاید ہمیں کافی پینے کو اور کیک کھانے کو مل جائیں ۔ اس کا قیاس درست نکلا ۔ پب کی ایک دیوار پر بہت سی تصویریں آویزاں تھیں ۔ ان میں سے ایک میں میشائیلہ اپنے والدین کے ساتھ کھڑی تھی ۔ دونوں قد کے بونے تھے اور ان کے بالوں کا رنگ کالا تھا ۔ جب کہ میشائیلہ بلونڈ تھی اور قد میں ان سے ڈیڑھ دو فٹ اونچی تھی ۔ کوزیما نے کہا کہ میشائیلہ ان سے اتنی مختلف ہے کہ وہ ان کی بیٹی نہیں لگتی ۔ اس پر میشائیلہ نے سنایا کہ پینتیس سال کی عمر میں اس کے دونوں گردے جواب دے گئے تھے ۔ اس کی ماں اور باپ دونوں نے اسے گردہ ٹرانسپلانٹ کے لئے دینا چاہا ۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی ۔ کیونکہ جب خون کے ٹسٹ لئے گئے، تو پتہ چلا کہ میشائیلہ کا تعلق ایک ایسے بلڈ گروپ سے ہے، جو بہت کم، شاید دس ہزار میں ایک پایا جاتا ہے ۔ ٹسٹ لینے والے ڈاکٹر نے کہا کہ میشائیلہ ان کی بیٹی نہیں ہو سکتی ۔ جب اس نے ماں سے اس بارہ میں پوچھا، تو اس نے کہا کہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں، مگر باپ سے اس کا ذکر نہ کرنا ۔ پتہ چلا کہ وہ ان کی لے پالک تھی، جسے انہوں نے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا ۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین انہی دنوں میں ایک عورت کسی حادثہ میں مر گئی، جس کا بلڈ گروپ وہی نکلا، جو میشائیلہ کا تھا ۔ اس عورت کے گردے نے میشائیلہ کو دوسری زندگی بخشی، جس کے سہارے پر وہ جی رہی تھی ۔

کلیمنز نے کہا کہ اس نے اور اس کے کنبہ کے جملہ افراد نے اپنے اعضاء کو موت کے بعد ٹرانسپلانٹ کے لئے وقف کر دیا ہے ۔ اس کا محرک اس کی ایک بہن بنی تھی، جس نے اپنی موت سے صرف ایک ماہ قبل اپنے اعضاء کو اس مقصد کے لئے وقف کیا تھا ۔ اس وقت وہ اچھی بھلی تھی اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی موت دروازے پر کھڑی ہے ۔ وہ اپنے خاوند اور بچوں سمیت گرمیوں کی تعطیلات گذارنے کے لئے ٹاونس کے پہاڑی علاقہ میں گئی ۔ ایک روز سیر کرتے ہوئے وہ ایک ٹیلہ کے پاس سے گذر رہے تھے کہ چوٹی پر بکریوں کے کھروں کے نیچے سے پتھر لڑک پڑے ۔ ایک پتھر اس کی بہن کے سر پر آن کر لگا اور وہ سخت زخمی ہوئی ۔

ہسپتال کی گاڑی کے آنے تک اس کا سارا خون نچڑ چکا تھا اور وہ اپنے خاوند کے بازوؤں میں دم توڑ چکی تھی ۔ خدا جانے کس کس مریض کو اس کے اعضاء ٹرانسپلانٹ کئے گئے تھے ۔ البتہ اسے یہ پتہ ہے کہ اس کی بہن کا بلڈ گروپ بھی بہت کم پایا جاتا ہے ۔ اتفاق ایسا تھا کہ اس کی بہن کی موت عین اسی سن بلکہ اسی مہینہ میں ہوئی تھی ، جس میں میثائیلہ کو گردہ ٹرانسپلانٹ کیا گیا تھا ۔

کلیمنز کے اصرار پر ایک روز معدنی پانی کے گرم چشمہ پر نہانے کے لئے جانے کا پروگرام بنا ، جہاں پر انسان کھلے باغ میں بنے ہوئے تالاب میں سردیوں کے موسم میں بھی باہر پیراکی کر سکتا ہے ۔ جگہ بہت پر فضا تھی اور ہمیں زائرین کی لمبی قطار میں لگ کر اندر جانا پڑا ۔ ہم دونوں تو منٹوں میں جانگیئے پہن کر کیبن سے باہر آگئے ۔ مگر دونوں عورتوں نے خاصی دیر کر دی ۔ کلیمنز کو یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ میثائیلہ کس قسم کا نہانے کا لباس پہن کر آئے گی ۔ اس نے کہا کہ مزا تو تب ہے کہ وہ ٹونگا پہن کر آئے ، جس کا ایک حصہ چھاتیوں کو ڈھکتا ہے اور دوسرا جانگیئے کی طرح نچلے حصہ بدن کو ۔ اس کی امید بر آئی اور وہ سچ مچ ٹونگا پہنے ہوئے نکلی ، جو اس پر خوب سج رہا تھا ۔ کوزیما بھی خوبصورت لگ رہی تھی ۔ مگر اس کا نہانے کا لباس اتنا موڈرن نہ تھا جتنا میثائیلہ کا ۔ جب وہ ہمارے قریب پہنچیں ، تو میری نظر میثائیلہ کے بائیں کولہے پر پڑی ، جس پر ایک مٹھی جتنا بڑا مسا دکھائی دے رہا تھا ۔ کلیمنز کی نظریں بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں ۔ میثائیلہ نے ہمیں اپنے کولہے کی طرف تکتے ہوئے دیکھا ، تو ہنس کر کہا کہ وہ اس کا ٹریڈ مارک ہے ۔

شام کے کھانے کے بعد کلیمنز اپنی عادت کے خلاف اپنے کمرے میں چلا گیا ، کیونکہ اسے اپنے کنبے سے فون پر کوئی لمبی چوڑی بات کرنی تھی ۔ اگلی صبح ناشتہ کے وقت اس نے کہا کہ آئندہ اتوار کے روز اس کی بڑی بہن کی سالگرہ ہے ، جس کو منانے کے لئے دونوں بہنیں اور دونوں بھائی کلینک میں آ رہے ہیں ۔ اس نے ہمیں اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی ، جس کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ یادگار رہے گی ۔ کوزیما نے پوچھا کہ کیا وہ اپنے کنبہ کو اپنا " کلینکی سایہ " پیش کرنا چاہتا ہے ۔ کلیمنز نے جواب دیا کہ وہ ایک چھوڑ تین سائے پیش کرے گا ۔

اتوار کے روز دوپہر تک کلیمنز کی بہنیں اور بھائی پہنچ گئے اور ہم ان کے ساتھ گاؤں کے ریستوران میں جا کر بیٹھے ۔ اس کی بہن کی صحت پر جام نوش کیا گیا، جس کی اس روز سالگرہ تھی ۔ پھر انہوں نے اپنے آبائی شہر کی تصویریں نکال لیں، جو پیچھے شلیزیا میں رہ گیا تھا ۔ ایک تصویر کو دیکھ کر میشائیلہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اس میں ایک سفید بالوں والی بوڑھی عورت ایک دوکان کے باہر کھڑی تھی ۔ اس نے کہا کہ یہی بڑھیا اس کو خوابوں میں نظر آیا کرتی ہے اور اسی دوکان میں بوڑھا جلد ساز بیٹھتا ہے ۔ کلیمنز نے اپنے ایک بھائی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس کا نام ہانس ہے، جس کی طرف تمہیں دادی کاغذ دے کر کشتی بنوانے کے لئے بھیجتی تھی ۔ پھر اس نے کہا کہ آخری ثبوت کہ میشائیلہ ان کی گمشدہ بہن ہے اس کو تب ملا، جب اس نے میشائیلہ کے بائیں کولہے پر مٹھی جتنا بڑا مسا دیکھا ۔ اس نے البم میں سے ایک تصویر نکال کر سامنے رکھ دی، جس میں ایک چھوٹی سی ننگی بچی نظر آرہی تھی، جس کے کولہے پر مسا صاف دکھائی دے رہا تھا ۔ کلیمنز کچھ دیر تک خاموش رہا، جس کے دوران ہم نے بچی کی تصویر کو باری باری غور سے دیکھا ۔ پھر کلیمنز نے ایک دوسری بچی کی تصویر البم میں سے نکال کر میشائیلہ کو دی ۔ اس نے کہا کہ یہ ہماری بہن انگرڈ کی تصویر ہے، جس کا گردہ تمہیں ٹرانسپلانٹ کیا گیا تھا ۔ اس نے کہا کہ اس نے کلینک کے ریکارڈ میں سے میشائیلہ کا بلڈ گروپ نکلوا کر اس کا انگرڈ کے بلڈ گروپ سے موازنہ کیا، تو ان کا ایک ہونا ثابت ہوا ۔ کلیمنز نے کہا کہ میشائیلہ کے مل جانے سے ہم پھر سات ہو گئے ہیں، کیونکہ میشائیلہ کے بدن میں انگرڈ کا گردہ زندہ سلامت موجود ہے ۔

(بون (جرمنی) ۔ ۲۲ اگست ۱۹۹۶ء)

گولڈن شاٹ

رات ہم نے پاموکلے میں گذاری تھی، جہاں پر ترکی کا مشہور عالم گرم پانی کا چشمہ پایا جاتا ہے۔ گرم پانی میں سے نکلنے والا چونا ٹھنڈی ہوا کے لگنے سے جم جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں منبع کا دہانہ اور ارد گرد کا علاقہ، جہاں پر پانی بہتا ہے، دن بدن بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ عمل ہزاروں یا شاید لاکھوں سالوں سے جاری ہے، جس کے سبب چشمہ کا دہانہ ایک پہاڑی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ڈینزلی کے قصبہ سے چشمہ تک پہنچنے کے لئے بس لینی پڑتی ہے۔ چشمہ کے دہانے پر ہوٹل، ریستوران اور تحائف کی دوکانیں ہیں۔ ہوٹل کے عین وسط میں بڑا تالاب ہے اور ہر کمرے کے سامنے باہر کی طرف بالکنی کی بجائے علیحدہ تالاب بنے ہوئے ہیں، جن میں سے پانی گذر کر وادی کی طرف بہتا ہے۔ آدھی رات تک ہم قدرت کے اس نادر تماشے سے لطف اندوز ہوتے اور گرم پانی میں نہاتے رہے۔ نیچے وادی میں دور دور تک نظر جاتی ہے اور انسان ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر سے گذرنے والی سڑک کو، جو دن رات چلتی ہے، بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ ہم ازمیر سے آئے تھے اور ہمیں ایک رات پاموکلے میں گذارنے کے بعد اگلے روز انطالیہ جانا تھا۔

ترکی میں بسیں وقت کی پابندی سے چلتی ہیں اور بے حد صاف ستھری ہوتی ہیں۔ کیا مجال ہے جو کاغذ کا کوئی پرزہ یا سگریٹ کا ٹوٹا بس کے فرش پر پڑا ہوا ملے۔ سیٹوں کے ساتھ ڈسٹ بن لگے ہوتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کنڈکٹر اوے ڈی کولون کا بس میں اسپرے کرتا اور اسے سواریوں کے ہاتھوں پر چھڑکتا ہے، جسے لوگ ہاتھوں اور چہرے پر مل لیتے ہیں۔ اس وجہ سے بس میں ہمہ وقت ایک بھینی بھینی خوشبو پھیلی

رہتی ہے۔ سواریوں کو رستے میں معدنی پانی کی ٹھنڈی بوتلیں پینے کے لئے مفت پیش کی جاتی ہیں۔ ہم اس مزیدار پانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، جب بس ایک چھوٹے سے قصبہ کے اسٹینڈ پر رکی اور دو سواریاں چڑھیں۔ ان میں سے ایک عام سا دیہاتی تھا۔ جب کہ دوسرا دوپہر کی گرمی میں کالا گرم سوٹ پہنے ہوا تھا اور امریکن طرز کا ہولڈال اٹھائے ہوئے تھا۔ اوتا نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ کیا اس ڈینڈی کو گرمی نہیں لگتی؟

ڈینڈی نے بس میں داخل ہونے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑائی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک نوجوان یورپین عورت کے پہلو میں بیٹھنا چاہا، جو اپنے ڈیل ڈول سے وٹامن اشتہاروں والی دوشیزہ سے کسی طرح کم صحت مند نہ لگتی تھی۔ اس کی سڈول ننگی باہیں مردوں کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، ڈرائیور نے اسے یہ کہہ کر دوشیزہ کے پہلو میں بیٹھنے سے روک دیا کہ بس آدھی سے زیادہ خالی ہے۔ اس نے ہماری سیٹ سے اگلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا، جو خالی تھی، اس عرصہ میں بس ایک نہایت زرخیز علاقہ میں سے گذر رہی تھی۔ ہر کوئی کھڑکی میں سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ ڈینڈی کے کان ہماری طرف لگے ہوئے تھے۔ اور اگرچہ ہم آپس میں جرمن بول رہے تھے، وہ ہماری باتوں کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ جب میں نے اوتا کو ڈرائیور کی طرف متوجہ کیا، جو اپنی جماہی کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، تو ڈینڈی نے بلند آواز سے ڈرائیور کو سنبھل کر بس چلانے کو کہا اور پوچھا کہ وہ کب سے ڈیوٹی پر ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ وہ چار گھنٹوں سے بس چلا رہا تھا اور اگلے اسٹاپ پر کنڈکٹر، جو دراصل اس جیسا منجھا ہوا ڈرائیور ہے، اس کی جگہ لے لے گا۔ ڈینڈی نے ہمیں مخاطب کر کے بہترین جرمن میں بتایا کہ ترکی میں بے شمار حادثات ڈرائیوروں کی تھکاوٹ کے سبب ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں آرام کرنے کا وقت نہیں دیا جاتا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک عزیز دوست کی تدفین میں حصہ لے کر آ رہا ہے، جو اسی ہفتے ایک بس کے حادثہ میں مارا گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اخبار میں اس حادثہ کے بارے میں پڑھا تھا۔ حادثہ میں ملوث بس کا ڈرائیور پورے بارہ گھنٹوں سے

ڈرائیو کر رہا تھا۔ قیاس کیا جاتا تھا کہ وقتی طور پر اس کی آنکھ لگ گئی تھی، جس کے سبب بس ایک کھڈ میں جا گری تھی۔ پندرہ مسافر اس حادثہ میں مارے گئے تھے۔

اگلا اسٹاپ ایک درمیانے درجہ کا شہر تھا، جہاں پر بس آدھا گھنٹہ رکی رہی، تاکہ سواریاں ریستوران میں کچھ کھا پی لیں اور ٹائیلٹ سے ہو آئیں۔ ڈینڈی سارا وقت ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ آدمی خاصا دلچسپ تھا اور ہمیں اس کی باتوں میں مزا آنے لگا۔ جب بس چلنے لگی، تو اس نے کہا کہ وہ اس قصبہ کی ایک نہایت اہم چیز ہمیں دکھائے گا۔ آبادی کے خاتمے پر اس نے ایک فارم کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہ اسلامی ملک ترکی کی مشہور ترین فارم ہے، جہاں پر خنزیر پالے جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ کو سلیوٹ کرنے کے انداز میں اپنے سر تک اٹھا کر لے گیا۔ پھر اسے دل پر رکھ کر آداب بجا لانے کے انداز میں اس نے جھک کر السلام علیکم کہا۔ آگے چل کر پتہ چلا کہ یہ اس کا خاص مزاح تھا۔ وہ ہمیں اپنے ملک میں پائے جانے والے تضادات دکھا کر کھٹ سے سلیوٹ کرتا اور السلام علیکم کہتا تھا۔

اس کی منزل ہماری طرح انطالیہ تھی، جہاں پر اس کی رہائش تھی۔ اس نے ہمیں اچھا سا ہوٹل تلاش کر دینے کی پیش کش کی۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ سرجن تھا۔ اس نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں پر اور سوئٹزرلینڈ میں بیس برسوں تک پریکٹس کرتا رہا تھا۔ آخری نو برس اس نے زیورک کی ایک کلینک میں کام کیا تھا، جہاں پر دنیا بھر سے امیر لوگ فیس لفٹنگ کرانے کے لئے آتے ہیں۔ وہ پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا۔ مگر ترکی میں، جہاں پر وہ دو سال قبل واپس لوٹا تھا، لوگوں کو ایسے فضول اپریشنوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس وجہ سے سر توڑ کوششوں کے باوجود اسے اپنی پریکٹس کو جمانے میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔

ڈاکٹر فخری کا تجویز کردہ ہوٹل ہمیں پسند آیا اور ہم نے تین روز تک وہاں پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ شام کا کھانا ہم نے اکٹھے ایک ریستوران میں کھایا، جس کے دوران ڈاکٹر فخری نے بتایا کہ وہ اپنے شہر میں کسی ڈبے کتے کی طرح پہچانا جاتا ہے۔ اسکول کے زمانے میں اس کو بہترین کھلاڑی اور قابل ترین طالب علم ہونے کے اعزازات ملے تھے۔ اس کا نام اسکول کے بورڈ آف آنر پر درج ہے۔ یونیورسٹی کی

تعلیم اس نے وظیفہ لے کر حاصل کی تھی ۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن کر اپنے شہر میں پریکٹس کرے اور غریب لوگوں کا مفت علاج کرے ۔ استنبول سے ڈگری لینے کے بعد وہ طب کی ایڈوانس تعلیم کی خاطر جرمنی چلا گیا تھا اور پھر ادھر کا ہی ہو رہا بلکہ اپنے باپ کے مرنے پر بھی وطن واپس نہ لوٹا تھا ۔ اس کی بوڑھی ماں اس عرصہ میں چلنے پھرنے سے محتاج ہو گئی تھی ۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا شادی کرے اور وہ مرنے سے پہلے اپنے پوتوں پوتیوں کو دیکھ لے ۔ مگر ڈاکٹر فخری شادی کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا ۔

اس امر کا راز اگلے روز کھلا ، جب ہم پچھلے پہر ڈاکٹر فخری سے ملنے کے لئے اس کی کلینک میں پہنچے ۔ وہاں پر ہمارا استقبال ایک سوئس عورت نے کیا ، جو اسی روز زیورک سے آئی تھی ۔ ڈاکٹر فخری نے بتایا کہ روزے ماری اس کے قیام زیورک کی یادگار ہے اور اس کو واپس لے جانا چاہتی ہے ۔ وہ اس سے قبل بھی دو بار آچکی ہے ، مگر اسے اپنے مشن میں کامیابی نہ ہو گی ۔ روزے ماری نے کہا کہ شام ہونے سے پہلے دن کے بارے میں آخری فیصلہ نہیں دینا چاہیئے ۔ کون جانتا ہے کہ شام پڑنے تک کیا کچھ وقوع میں آجائے ۔ وہ خاصی دلکش عورت تھی اور نوجوانی کے زمانے میں تو ہزاروں میں ایک رہی ہو گی ۔ وہ اتھلیٹک ٹائپ لگتی تھی ۔ ڈاکٹر فخری نے کہا کہ روزے ماری اوروبیک کی ماہر اور یوڈو کی سابقہ نیشنل چیمپین ہے ۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا ۔ مجھے وہ چالیس کے لگ بھگ لگی ، جب کہ اوتا کی رائے میں وہ پچاس کے پیٹے میں تھی ۔ ہمارا ارادہ دوسرے روز ایک ٹور پر جانے کا تھا ، جس کا انتظام ایک لوکل ٹریولنگ ایجنسی کی طرف سے کیا جا رہا تھا ۔ روزے ماری نے کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی ۔ ڈاکٹر فخری نے معذرت چاہی ، کیونکہ اسے اس روز ایک اپریشن کرنا تھا ۔

ہمارا پہلا اسٹاپ پرگے (Perge) تھا ، جو زمانہ قبل از مسیح میں ایک بڑا شہر تھا ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کی آبادی اپنے عروج کے زمانہ میں ایک لاکھ رہی ہو گی ؛ سٹیڈیم کے آثار پائے جاتے ہیں اور ایک تھیٹر کے ، جسے پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا ، اس میں پندرہ ہزار تماشائیوں کے لئے جگہ موجود تھی ۔ شہر کے مرکز میں واقع سڑک پر

جو کم و بیش ایک میل لمبی ہے ، دو رویہ دوکانیں ہوا کرتی تھیں ۔ ایک تین منزلہ گیٹ نما عمارت سے مارکیٹ کا آغاز ہوتا تھا ۔ گیٹ سے باہر تین چشمے پائے جاتے تھے ، جہاں پر عوامی حمام ہوا کرتے تھے ۔ چشموں کا پانی سوکھ چکا ہے اور حماموں کی صرف دیواریں کھڑی ہیں ۔

ہمارا دوسرا پڑاؤ اسپنڈوس (Aspendos) تھا ، جس کا تھیٹر مشہور زمانہ ہے اور مرمت کے بعد اتنی اچھی حالت میں ہے کہ وہاں پر ہر سال موسیقی کا میلہ لگتا ہے اور تھیٹر کھیلا جاتا ہے ۔ وہاں پر بیس ہزار تماشائیوں کے لئے بیٹھنے کا انتظام ہے اور بغیر لاؤڈ اسپیکر کے آخری سیٹ تک آواز نہایت عمدگی سے سنی جا سکتی ہے ۔ کسی نے کہا کہ اس بات پر یقین تب آ سکتا ہے کہ ہمارے سامنے اس کا مظاہرہ ہو ۔ روزے ماری فوراً گانا گانے کے لئے تیار ہو گئی ۔ ہم تھیٹر کی سب سے اوپر والی قطار میں جا کر بیٹھ گئے اور روزے ماری نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر کلاسیکی اوپیرا لاتراویاتا کا ایک گیت الاپا ۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ تھا کہ ہم داد دیئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اوتا نے کہا کہ ایسی مہارت پیدا کرنے کے لئے بہت ریاض چاہیئے ۔ اس کا خیال تھا کہ روزے ماری پروفیشل سنگر ہے ۔

روزے ماری نے ہمیں بعد میں بتایا کہ موسیقی اس کو اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھی ، جس نے بچپن میں ہی بیٹی کے لئے ایک پرائیویٹ استانی موسیقی سکھانے کے لئے رکھ لی تھی ۔ پھر اسکول پاس کرنے کے بعد اسے کنزرواٹوریم میں داخل کرا دیا گیا ، جہاں پر تین برسوں تک نامور استادوں کی نگرانی میں اس نے گانے کا فن سیکھا ۔ تعلیم کے خاتمہ پر اس کو جینوا کے اوپیرا ہاوس میں جگہ مل گئی ۔ وہیں پر اس کی ملاقات اپنے بعد میں ہونے والے خاوند سے ہوئی ، جو اس زمانے میں مقامی ہسپتال میں ڈاکٹر تھا ۔ چند سالوں کے بعد اس نے زیورک میں پرائیویٹ کلینک کھول لیا اور وہ اس شہر میں اٹھ گئے ۔ اس دن سے روزے ماری کا تھیٹر سے رابطہ ٹوٹ گیا ، کیونکہ اس کا خاوند اسے اس پیشہ سے وابستہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا ۔ دراصل اس کو موسیقی میں بالکل کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ روزے ماری نے کہا کہ حیرت کی بات ہے کہ جتنے بھی مرد اس کی زندگی میں آئے ، وہ سبھی موسیقی سے بے بہرہ تھے ۔ ڈاکٹر فخری بھی اس

سلسلہ میں مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسے اوپیرا میں جانا پڑ جائے، تو وہ اسے اپنے لئے سزا سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر فخری کے ساتھ اس کی ملاقات مشترکہ دوستوں کے گھر پر ہوئی تھی۔ وہ نیا نیا زیورک میں وارد ہوا تھا اور ابھی وہاں کی سوسائٹی سے متعارف نہ تھا۔ روزے ماری کے خاوند نے اسے آنے کو کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لائے گا، مگر ڈاکٹر فخری دعوت میں اکیلا آنکلا۔ کسی نے پوچھا کہ اپنی بیوی کو کیوں ساتھ نہیں لائے، تو اس نے کہا کہ اسے پتہ نہ تھا کہ بیوی کو ساتھ لانے کی شرط تھی' ویسے بیوی تو ایک طرف رہی، اس کی تو کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔ اس پر کسی نے کہا کہ بوائے فرینڈ رکھ لیا ہوتا۔ ڈاکٹر فخری نے جواب دیا کہ اس کا یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ جرمنی میں، جہاں پر وہ پہلے رہتا تھا، اس کو دوستوں کی کمی کی کبھی شکایت نہ ہوئی تھی۔ زیورک میں خدا جانے کیوں لڑکیوں اس سے بدکتی ہیں۔ پھر اس نے اضافہ کیا کہ دراصل اسے نوخیز کلیوں سے بڑھ کر کھلے ہوئے پھولوں میں دلچسپی ہے۔ اس پر کسی نے لقمہ دیا کہ کھلے ہوئے پھولوں کی اس محفل میں کمی نہیں۔ یقیناً اس کی پسند کا پھول بھی وہاں پر موجود ہوگا۔ روزے ماری نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر فخری کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک پھول کی تلاش میں نہ تھا۔ وہ تو ایک پوری کیاری کے بلکہ سارے باغ کے پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ مگر یہ راز اس وقت جا کے کھلا، جب روزے ماری اس کی محبت میں دونوں کانوں تک ڈوب چکی تھی۔

روزے ماری کی تقریر ابھی جاری تھی کہ ہماری کوچ سیدے (Side) میں پہنچ گئی، جو یونانیوں کے عروج کے وقت ایک بڑا ساحلی شہر تھا۔ ہمارے گروپ کو سب سے پہلے رومن تھیٹر میں لے جایا گیا، جس کی اوپر والی گیلری سے سیدے کا پورا گاؤں دیکھا جا سکتا ہے۔ میری اور اوتا کی نگاہیں گاؤں کے سب سے اونچے مکان کو تلاش کر رہی تھیں۔ ایسا مکان ہمیں ساحل کے کنارے پر نظر آ گیا۔ ہم نے اپنے گروپ سے تھوڑے وقت کے لئے رخصت چاہی، کیونکہ ہمیں گاؤں میں ایک ضروری کام سر انجام دینا تھا۔ ہماری توقع کے مطابق اس مکان میں ٹورسٹوں کے لئے

اپارٹمنٹ موجود تھے ۔ ہم نے اوپر والا اپارٹمنٹ اپنے لئے چنا، جہاں سے سمندر اور بیچ پر دور دور تک نگاہ جاتی تھی ۔ کرایہ طے کرنے اور اپنا سامان وہاں پر چھوڑنے کے بعد ہم گروپ کی طرف لوٹ گئے ۔ ہمارا ارادہ ٹور سے واپسی پر سیدے میں رک جانے کا تھا، جہاں پر ہم تین ہفتوں تک قیام کرنا چاہتے تھے ۔

سیدے کے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد ہمارا گروپ منوگاٹ کی آبشار کو دیکھنے کے لئے گیا ۔ آبشار تو خیر کچھ ایسی قابل ذکر نہیں، کیونکہ پانی محض چند گز کی اونچائی سے گرتا ہے ۔ مگر جگہ بہت پر فضا ہے اور پانی جس جھیل میں گرتا ہے اس میں مچھلیوں کی بھرمار ہے ۔ ہم نے کھانا باغ میں بنے ہوئے ریستوران میں کھایا، جو تازہ مچھلیوں سے بنایا گیا تھا اور بے حد لذیذ تھا ۔ اوتا نے یوگوسلاویہ کے نیشنل پارک پلٹوٹزے (Plitviče) کا ذکر چھیڑ دیا، جہاں پر سولہ جھیلیں مختلف عمودی سطحوں پر پائی جاتی ہیں ۔ ان کا پانی آبشاروں کی صورت میں اوپر سے نیچے والی جھیلوں میں گرتا ہے ۔ یہ نظارہ ایسا لافانی ہے کہ جس نے ایک بار دیکھ لیا ہو، وہ اسے ساری عمر نہیں بھول سکتا ۔ روزے ماری نے کہا کہ وہ وہاں پر جا چکی ہے ۔ بلکہ وہ سفر اس کا ڈاکٹر فخری کی معیت میں پہلا غیر ملکی سفر تھا ۔ انہیں آڈریا کا ساحلی علاقہ پسند آیا تھا اور وہ دو ہفتوں تک شیبے نک (Šibenik) میں ٹھہرے تھے ۔ اس کے خاوند کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا ۔ کیونکہ اس طرح اس کو اپنی ایک دوست کے ساتھ کوسٹاریکا جانے کا بہانہ مل گیا تھا ۔ روزے ماری نے کہا کہ ان کے ہاں ایک دوسرے پر پابندیاں لگانے کا رواج نہ تھا ۔ انہوں نے پہلے دن سے یہ طے کر لیا تھا کہ دونوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہو گی ۔ اور اس آزادی سے دونوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا تھا ۔

ہمارے ٹور کا آخری اسٹاپ الانیہ (Alanya) تھا، جو سلجوقوں کے زمانہ میں اہم ساحلی شہر تھا ۔ ان کا بنایا ہوا قلعہ اور کئی ایک مساجد تاریخی اہمیت کی حامل ہیں ۔ مگر شمالی یورپ سے موسم گرما میں حملہ آور ٹورسٹوں کے لئے یہ عمارتیں بس تھیٹر کے اسٹیج کی طرح ہیں ۔ انہیں دھوپ، سمندر اور کھانے پینے کے سامان کی فراوانی چاہیئے ۔ روزے ماری کو گلہ تھا کہ انہیں یہ چیزیں تو مل جاتی ہیں، مگر سارے بیچ پر ایک بھی ننگا شخص نظر نہیں آتا ۔ زیورک میں اس کے حلقہ کے سارے لوگ

نیوڈ کلب کے ممبر تھے ۔ جب ڈاکٹر فخری پہلی بار ان کے اسپورٹس کلب میں آیا، تو اسے پتہ نہ تھا کہ وہاں پر کھیلوں میں حصہ لینے والوں کو کپڑے اتارنے پڑتے ہیں ۔ روزے ماری اسے یہ بات بتانی بھول گئی تھی ۔ جب وہ کلب کی گراونڈ میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر فخری نے ننگی عورتوں کو دیکھا، تو بہت خوش ہوا، مگر جب اسے بتایا گیا کہ اسے بھی کپڑے اتارنے ہوں گے، تو وہ لوٹ جانا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اس طرح سرعام کپڑے اتارنے کے لئے تیار نہ تھا۔ روزے ماری نے اسے بمشکل روکا اور بتایا کہ مہمان کھلاڑیوں کو ابتداء میں نیکر پہننے کی اجازت ہے ۔ البتہ وہ اگر ایک دو بار کی شرکت کے بعد ممبر بننا چاہیئں، تو انہیں بھی کپڑے اتارنے پڑتے ہیں ۔ روزے ماری نے کہا کہ ڈاکٹر فخری بہت جلد اس کا عادی ہو گیا تھا۔

جب ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا، تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سیدے پہنچتے پہنچتے شام پڑ گئی ۔ بس نے ہمیں ہماری قیام گاہ کے سامنے اتارا۔ روزے ماری نے کہا کہ وہ اگلے ویک اینڈ پہ ڈاکٹر فخری کو ساتھ لے کر ہمیں ملنے کے لئے آئے گی ۔ اسے بھی سیدے پسند آیا تھا، جو دراصل قدیم انطالیہ کے کھنڈرات پر بنا ہوا مچھیروں کا چھوٹا سے گاؤں ہے ۔ اس کا نیا نام سلیمیہ تجویز ہوا ہے، مگر یہ نام لوگوں کی زبانوں پر نہیں چڑھتا ۔ ہر گھر میں، باغیچوں میں بلکہ سڑکوں اور گلیوں میں جگہ جگہ قدیمی تاریخی عمارتوں کے ستون کھڑے ہیں ۔ گاؤں کے مکانات ان پتھروں سے تعمیر کئے گئے ہیں، جو ہر طرف بکھرے پڑے ہیں اور جن کو محفوظ کرنا محکمہ آثار قدیمہ نے ضروری نہیں سمجھا تھا ۔ سیدے جیسا گاؤں پا کر ہم بہت خوش تھے، کیونکہ وہاں پر ساحلی مقامات والا شور شرابا نہ تھا۔ یوں بھی ٹورسٹوں کے ٹڈی دل کا حملہ شروع ہونے میں ابھی مہینہ بھر پڑا تھا۔ ہماری قیام گاہ ساحل کے عین اوپر واقع تھی، جہاں سے دو تین کلو میٹر لمبا بیچ شروع ہوتا تھا۔ جس کی سفید ریت شام کے دھندلکے میں چمک رہی تھی، دور باہر سمندر میں مچھیروں کی کشتیاں نظر آ رہی تھی، جن کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں ۔

تیسرے دن روزے ماری کا فون آگیا کہ وہ انطالیہ میں سخت بور ہو رہی ہے ۔ ڈاکٹر فخری دن بھر اپنی کلینک میں بیٹھا ہوا بیماروں کا انتظار کرتا رہتا ہے ۔ نہ وہ خود

باہر نکلتا ہے اور نہ اس کو کہیں پر جانے دیتا ہے۔ روزے ماری نے کہا کہ وہ سیدے آنا چاہتی ہے۔ اوتانے کہا کہ ہمارے اپارٹمنٹ میں ایک بیڈ روم خالی ہے اور اس کو مل سکتا ہے۔ اگلی صبح ڈاکٹر فخری خود اسے چھوڑنے کے لئے آیا۔ وہ رستے میں سے مچھلی لیتے آئے تھے، جس کو پکانے کی ذمہ داری روزے ماری نے اٹھائی۔ مجھے اور ڈاکٹر فخری کو دو گھنٹوں کے لئے گھر سے باہر بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر فخری نے اس روز اپنی کلینک کو خاص طور پر سیدے آنے کی خاطر بند کر دیا تھا۔ اس نے پھر ایک بار ترکی میں ڈاکٹروں کے مندے کاروبار کا قضیہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگا کہ جرمنی میں مریض ڈاکٹر کے مطب میں جاکر اپنی باری کے آنے کا انتظار کرتے ہیں، جب کہ ترکی میں ڈاکٹر کو مریضوں کی راہ تکنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی میں پبلک ہیلتھ انشورنس نہیں پائی جاتی اور لوگوں کو اپنے علاج کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس کے سبب بعض اوقات ضروری علاج کو بھی ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ جرمنی میں ہیلتھ انشورنس کے ہوتے ہوئے مریضوں کو ذرا بھر تردد نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ وہ ضرورت سے زیادہ دوائیں لکھوا کر لے آتے ہیں، جنہیں بعد میں ضائع کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر فخری نے کہا کہ اس نے جو وقت جرمنی اور بالخصوص سوئٹزرلینڈ میں گذارا تھا، وہ اس کی زندگی کا بہترین وقت تھا۔ میں نے پوچھا کہ پھر وہ کیوں وہاں سے چلا آیا تھا، کیا اس کو وہاں پر رہنے اور کام کی اجازت حاصل کرنے میں مشکل پیش آئی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات نہ تھی۔ وہ اگر چاہتا تو ہمیشہ کے لئے وہاں پر رہ سکتا تھا۔ بلکہ وہاں کی شہریت لے سکتا تھا۔ وہ وہاں پر ایک نامور کلینک میں کام کر رہا تھا اور پھر روزے ماری کا خاوند پیٹر زیورک کی اہم شخصیت ہے، جس کے اشارے پر اس کے لئے بند دروازے بھی کھل سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ روزے ماری کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو تو میں جان گیا ہوں، مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کے اور پیٹر کے مابین کیا رشتہ ہے۔ اس نے کہا کہ پیٹر سے اس کا ملنا ایک اشتہار کے ذریعہ ہوا تھا، جو مقامی اخبار میں چھپا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ ایک غیر متعصب جوڑا نئے دوست بنانا چاہتا ہے، جو ان کی طرح غیر متعصب ہوں۔ ڈاکٹر فخری نے کہا کہ اس نے سمجھا کہ یہ لوگ یقیناً غیر ملکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے بھی

خط لکھ دیا اور پیٹر کے ساتھ ملنے کی تاریخ مقرر کر لی ۔ جب وہ مقررہ شام کو پیٹر کے گھر گیا ، تو وہاں پر چھ جوڑے جمع تھے ۔ صرف وہ اکیلا آیا تھا ۔ کیونکہ اسے اس وقت تک پتہ نہ تھا کہ ان لوگوں کا غیر متعصب ہونا جنسی معاملات سے متعلق تھا ۔ روزے ماری نے جھٹ سے اپنی ایک سہیلی کو فون کر کے اس کی رفاقت کے لئے بلا لیا ۔ چونکہ حاضرین محفل ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے ، اس لئے آدھی رات تک سب لوگ سمال ٹاک اور پینے پلانے میں مشغول رہے اور ہر کوئی اپنی اپنی فتوحات کے قصے بڑھا چڑھا کے سناتا رہا ۔ پھر کسی نے تجویز پیش کی کہ مرد اپنی کاروں کی چابیاں میز پر رکھ دیں اور عورتیں اپنی اپنی پسند کی چابی اٹھالیں ۔ ڈاکٹر فخری نے کہا کہ اسے سب سے زیادہ روزے ماری پسند آئی تھی ۔ اس لئے وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ روزے ماری نے اس کے دل کی آواز کو سن لیا تھا اور اس کی چابی کو اٹھایا تھا ، وہ اسے اپنے گھر لے گیا اور وہ رات دونوں نے اکٹھی گذاری ۔ اس کے بعد اسے دوسری عورتوں کی رفاقت بھی ملتی رہی اور وہ کئی ایک غیر متعصب حلقوں میں جاتا رہا ، مگر روزے ماری سے بہتر عورت کہیں پر نہ ملی ۔ ہوتے ہوتے اس کی دوستی پیٹر اور روزے ماری کے ساتھ اتنی گہری ہو گئی کہ وہ ان کے بنگلہ میں ان کے ساتھ رہنے لگا ، بلکہ اس نے پیٹر کی کلینک میں کام شروع کر دیا ، جہاں پر فیس لفٹنگ کے پلاسٹک اپریشن کئے جاتے تھے ۔ ڈاکٹر فخری کی داستان نے اس قدر طول پکڑا کہ جب ہم دو گھنٹوں کے بعد گھر واپس لوٹے ، تو اس کے کہنے کے مطابق ابھی بہت کچھ بیان کرنے کو باقی تھا ۔

روزے ماری کو صبح سویرے ناشتہ سے پہلے جوگنگ کرنے کا شوق تھا ۔ وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتی تھی اور ساحل کے کنارے کنارے چار پانچ میل تک دوڑ لگانے کے بعد لوٹتی تھی ۔ ہمیں خدشہ تھا کہ کہیں اس کو راستے میں کوئی ناگوار واقعہ نہ پیش آجائے ۔ ہماری باتیں سن کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمارے خدشات کو ایک طرف دھکیل دیا اور کہا کہ جو کوئی اس پر حملہ کرے گا ، اس کو منہ کی کھانی پڑے گی ۔ آخر اس نے کراٹے کا فن کس لئے سیکھ رکھا ہے ۔ نیویارک میں ایک دفعہ دو غنڈوں نے اس کا ہینڈ بیگ چھیننا چاہا تھا ۔ مگر اس نے

انہیں سیکنڈوں کے اندر مار بھگایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ان کی ایک آدھ پسلی بھی توڑ دی تھی۔

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ریستوران میں کھایا، جو ٹھنڈے بینگن، توریوں اور چاول پر مشتمل تھا۔ آخر میں سویٹ ڈش کے طور پر کھیر پیش کی گئی، جس کا نام ترکی زبان میں ستلج ہے۔ شاید ہندوستان کے دریا ستلج کا نام کسی ترک کا دیا ہوا ہے، جس کے گدلے دودھیا پانی کو دیکھ کر اسے اپنے وطن کی کھیر یاد آ گئی تھی۔ میں نے روزے ماری سے جاننا چاہا کہ ڈاکٹر فخری نے زیورک کو وجہ سے چھوڑا تھا، جہاں پر اس کے اپنے بیان کے مطابق وہ بہت خوش تھا۔ روزے ماری کو اس معاملہ پر بات کرنے میں کچھ باک تھا۔ مگر جلد ہی اس نے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پا لیا اور بتایا کہ اس کے پیچھے ایک لڑکی کا ہاتھ تھا۔ وہ لڑکی روزے ماری کی نظر میں اس قابل نہ تھی کہ ڈاکٹر فخری اسے اتنی اہمیت دیتا۔ مگر محبت کی راہیں بہت پرپیچ ہیں اور انسان ان کا احاطہ منطق اور کامن سنس سے نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکی یوں تو بہت خوبصورت اور پڑھی لکھی تھی۔ مگر بدقسمتی سے اس کا اٹھنا بیٹھنا مشکوک لوگوں کے ساتھ تھا اور وہ خود بھی ڈرگ ایڈکٹ تھی۔ پھر ڈاکٹر فخری خود اس کے لئے ہیروین خریدنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جانے لگا۔ اس وجہ سے کلینک کو اپنی خوش نامی اور ڈاکٹر فخری کے ذاتی تحفظ کی خاطر قدم اٹھانا پڑا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، جس کے سبب وہ اس قدر بگڑا کہ استعفیٰ دے کر ترکی واپس چلا آیا۔ روزے ماری کو شبہ تھا کہ وہ لڑکی بھی وہیں کہیں ترکی میں ہو گی۔ وگرنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ڈاکٹر فخری اپنی اچھی بھلی پوزیشن پر لات مار کر انطالیہ میں آن بیٹھا تھا، جہاں پر اس کو مہینہ بھر میں دو تین اپریشن مل جائیں، تو غنیمت ہے۔ وہ اسے واپس لے جانا چاہتی ہے۔ مگر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی۔

اتوار کے روز ڈاکٹر فخری ہمیں اپنے گاؤں دوشم آلٹے کی سیر کرانے کے لئے لے گیا۔ اس کے باپ کے گھر میں چند سال پہلے تک ایک پھوپھی رہتی تھی۔ جب تک وہ زندہ تھی، اس وقت تک خاندان کے لوگوں کا ادھر آنا جانا تھا۔ اس کی وفات کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کا آبائی مکان خستہ حالت میں تھا اور اب اس میں

ایک مزارع فیملی رہتی تھی ۔ گاؤں کی مسجد اس مکان کے پہلو میں تھی، جہاں پر ڈاکٹر فخری کے باپ نے اپنے بچپن میں قرآن حفظ کیا تھا ۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا بھی حافظ قرآن بنے ۔ اس وقت کی کچھ سورتیں اسے یاد تھیں اور وہ گاہے گاہے ترنگ میں آکر ان کی تلاوت خوش الحانی سے کرتا تھا ۔ وہ ہمیں ایک کسان کے گھر لے گیا، جس کی بیوی سات بچوں کی ماں تھی اور گھر بار کا سارا کام کرنے کے بعد فرصت کے لمحات میں قالین بنتی تھی ۔ ہمیں اس کا بنا ہوا ایک قالین پسند آیا، جو ہم نے خرید لیا ۔ ہماری خاطر داری اس گھر میں دودھ کے ساتھ کی گئی اور چلتے وقت تازہ انڈے دیئے گئے ۔ بچوں نے اس عرصہ میں صحن کے باغیچے میں سے پھول کاٹ کر ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا ۔ ایک دوسرے گھر میں، جہاں پر تین بوڑھی عورتیں مقیم تھیں، ہمیں خود تیار کردہ قالین دکھائے گئے، جن کے شوخ رنگ ہمیں پسند نہ آئے ۔ مگر روزے ماری کو اس قدر بھائے کہ اس نے ایک قالین خرید لیا ۔ ہمیں وہ گاؤں پسند آیا اور وہاں کے باسیوں کی سادگی، ان کے پیار و محبت کے اظہار اور قالین بافی کے فن میں انکی مہارت نے ہمارے دل موہ لئے ۔

اس سے اگلے روز روزے ماری کی واپسی تھی ۔ اس لیئے وہ رات کو ہی انطالیہ منتقل ہو گئی ۔ وہ ڈاکٹر فخری کو منوانے کی آخری کوشش کرنا چاہتی تھی ۔ ہم نے ہوائی اڈے پر اس کو الوداع کہنے کے لیئے آنے کا وعدہ کیا ۔ ہم مقررہ وقت پر پہنچے تو پتہ چلا کہ روزے ماری ناکام واپس جا رہی تھی ۔ ائرپورٹ سے لوٹتے ہوئے میں نے ڈاکٹر فخری سے اس لڑکی کے بارہ میں جاننا چاہا، جس کا ذکر روزے ماری نے کیا تھا ۔ ڈاکٹر فخری تھوڑی دیر تک خاموش رہا ۔ پھر اس نے کہا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس نے ٹوٹ کر محبت کی تھی ۔ ویسی لڑکی انسان کو عمر میں ایک بار ملتی ہے اور وہ بھی اگر اس کی قسمت اچھی ہو ۔ ایڈتھ، یہ اس لڑکی کا نام تھا، کی سبز آنکھیں کسی جھیل کی طرح گہری تھیں ۔ ڈاکٹر فخری نے کہا کہ اسے پتہ ہے کہ وہ پیار کیئے جانے کے قابل تھی اور بے حد پیار کرنے والا دل رکھتی تھی ۔ مگر اس کی روح میں کسی نے جھانک کر نہ دیکھا تھا ۔ اس کے پیار کا کسی نے جواب نہ دیا تھا ۔ اس کی ڈرگ ایڈکشن کا سبب دراصل اس کا اکلاپا تھا، جس میں اس کے ماں باپ نے اس کو دھکیل دیا تھا ۔

دوست یاروں نے اس کی محبت کی پیاسی روح کو چرکے پہ چرکے دیئے تھے ۔ ایک ایسی لڑکی بلاوجہ ہیروین کا سہارا نہیں لیتی ۔ وہ ہر قیمت پر اس کو ڈرگ ایڈکشن سے بچانا چاہتا تھا ۔ اسے امید تھی کہ اسے اس میں کامیابی ہو گی ۔ مگر روزے ماری نے اس کی اسکیم پر پانی پھیر دیا تھا ۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہا، جیسے وہ اپنے دل میں ہمیں اپنا راز بتانے یا نہ بتانے کے بارہ میں فیصلہ کر رہا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ۔ اس نے کہا کہ روزے ماری کو اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ وہ میری محبوبہ کی قاتلہ ہے ۔ اس نے ایڈتھ کو دس ہزار فرانک اس شرط پر دیئے تھے کہ وہ زیورک سے چلی جائے اور میرے ساتھ ملنا چھوڑ دے ۔ جانتے ہو کہ ایک ڈرگ ایڈکٹ کو اتنی بڑی رقم دینے کا کیا مطلب ہے ۔ ایڈتھ سیدھی ریلوے اسٹیشن پر ڈرگ ڈیلر کے پاس گئی اور اس سے مصفیٰ کوالٹی کی ہیروین بڑی مقدار میں خریدی ۔ اس کے بعد اس نے میرے نام ایک الوداعی چھٹی لکھی اور اپنے آپ کو گولڈن شاٹ دیا ۔ جب میں دو روز کے بعد اس کے فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوا، تو وہ کبھی کی مر چکی تھی ۔

(شیراز (ایران) ۔ ۶ جولائی ۱۹۹۶ء)

بنت حرام

قاہرہ کے ہلٹن ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میری نظر ایک حسینہ پر پڑتی ہے اور دل و دماغ پر بجلی سی کوند جاتی ہے۔ صرف ایک روز قبل میں اسے قدیمی مصری تہذیب کے میوزیم "دار المتحف" میں دیکھ چکا تھا، مگر وہاں پر لڑکی نے ابھی گوشت پوست کا روپ نہ دہارا تھا، بلکہ ایک ہزاروں سال پرانا بت تھی، جس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انسان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں بھی دوسرے زائرین کے ساتھ دیر تک کھڑا اسے تکتا اور دل ہی دل میں بت تراش کے فن کی داد دیتا رہا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ ایسی مکمل خوبصورتی کوئی فن کار اتنی دیر تک پیدا نہیں کر سکتا، جب تک اس نے خود اس کا جیتا جاگتا نمونہ نہ دیکھا ہو۔ اور اب وہ جیتا جاگتا نمونہ میرے پہلو میں کھڑا لفٹ کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ویسا ہی فولڈنگ ہولڈر پکڑ رکھا تھا، جیسا میں نے اٹھایا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں ایک ہی کانفرنس میں شرکت کرنی تھی اور ہم دونوں تاخیر سے پہنچ رہے تھے۔ کانفرنس کا افتتاح بارہ بجے تھا اور اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس طرح مجھے اس کو مخاطب کرنے کا بہانہ مل گیا۔ ہم دونوں کو قاہرہ کے ٹریفک جام نے وقت پر پہنچنے سے باز رکھا تھا۔

خدا خدا کر کے لفٹ آئی۔ ہمارے سوا وہاں پر اور کوئی نہ تھا، حتیٰ کہ لفٹ بوائے بھی شاید دوپہر کے وقفے پر جا چکا تھا۔ میں نے آخری منزل کا بٹن دبایا، جہاں پر کانفرنس کا انعقاد تھا۔ اور لفٹ سرعت کے ساتھ اوپر چڑھنے لگی۔ ایکا ایکی بجلی جاتی رہی، بلب گل ہو گیا اور لفٹ دو منزلوں کے درمیان لٹک کر رہ گئی۔ تاہم لفٹ میں

بالکل اندھیرا نہ ہوا۔ کیونکہ اس کا کچھ حصہ آٹھویں منزل پر جھانک رہا تھا اور باہر سے کسی قدر روشنی چھن کر اندر آرہی تھی۔

"پہلے ٹریفک جام اور اب بجلی کا تعطل، خدا جانے کانفرنس روم میں پہنچنے تک ہمارے راستے میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آئیں گی"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں کے حالات سے واقف نہیں ہیں، وگرنہ آپ کی ہنسی جاتی رہتی"۔

میں نے حیرت سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا، جو بے حد تنا ہوا تھا، جیسے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا تھا۔ اس میں میرا بھلا کیا قصور تھا کہ بجلی رک گئی تھی۔ یہ چیز ساری دنیا میں آئے دن ہوتی رہتی ہے۔

"چند منٹوں کی تو بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ آدھ پون گھنٹہ لگے گا"۔ میں نے تسلی دلانے کے لئے کہا۔

"چند منٹوں کی؟ محترم ہم یورپ میں نہیں ہیں۔ قاہرہ میں جب بجلی جاتی ہے تو گھنٹوں اور دنوں تک بحال نہیں ہوا کرتی"۔

"آپ کی معیت میں مجھے دنوں یا ہفتوں تک یہاں پر محبوس ہو کر رہنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں"۔

"مگر مجھے یہ چیز بالکل پسند نہیں ہے۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میرے لئے ایک غیر مرد کے ساتھ یہاں پر بند ہونا کیسی مشکلات کے پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ آپ کا بھلا کیا جاتا ہے، البتہ میرے نام پر دھبہ لگ جائے گا"۔

اس پہلو سے میں نے سچ مچ معاملے پر غور نہ کیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ لڑکی، جو پیرس کے آخری فیشن کا ماڈل لباس پہنے ہوئے تھی، صرف ظاہری طور پر مغربی تہذیب کو اپنائے ہوئے تھی۔ جب کہ اس کی زندگی پر مصری تہذیب کے پھندے بدستور بے حد مضبوط تھے۔ میں نے اسے تسلی دلانا ضروری سمجھا اور کہا:

"آپ بالکل مطمئن رہیئے، میں اپنے کونے میں دبکا ہوا کھڑا رہوں گا اور آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا"۔

"جناب آپ سے مجھے یہی امید ہے، مگر دنیا کا منہ کون بند کرے گا"۔

اتنے میں دوسری لفٹوں کے دروازے کوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم جیسے اس سگنل کے انتظار میں تھے۔ ہم نے بھی دروازے پر مکے مارنے شروع کر دیئے۔ باہر سیڑھیوں پر قدموں کی چاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہوٹل کے ملازمین لفٹوں میں محبوس لوگوں کو تسلی دلانے میں لگے ہوئے تھے اور ساتھ کے ساتھ پوچھتے جاتے تھے کہ کس لفٹ میں کون کون پھنسا ہوا تھا۔ لڑکی نے کہا کہ جب وہ ہماری لفٹ کے بارے میں پوچھیں، تو مجھے کسی قیمت پر نہیں بتانا چاہیئے کہ وہاں پر ایک مصری عورت میرے ساتھ بند ہے۔

"میرا نام آپ بالکل نہ لیں"۔ لڑکی نے مجھے خبردار کیا۔

"مجھے آپ کا نام معلوم ہی نہیں ہے۔ البتہ میں آپ سے اپنا تعارف کرا دیتا ہوں"۔

میں نے اپنا نام پتہ بتایا، مگر اس نے جواباً اپنا تعارف نہ کرایا۔ شاید اسے واقعی خطرہ تھا کہ میں ہوٹل کے ملازموں کے سامنے کہیں اس کا نام نہ لے دوں۔ عام طور سے بڑے ہوٹلوں کے پاس الیکٹرک اگریگیٹر ہوتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ ہلٹن ہوٹل میں بھی ایسا انتظام موجود ہوگا اور بہت جلد بجلی کی رسائی کا انتظام کر دیا جائے گا۔ لفٹ کے اندر گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میرے تو پسینے چھوٹ رہے تھے، کیونکہ میں نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے پہلے کوٹ اتارا، پھر نکٹائی کی گرہ کھول دی۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو کم سے کم یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ محفلوں میں ہلکا پھلکا لباس پہن کے جا سکتی ہیں۔ چنانچہ میرے ساتھ لفٹ میں محبوس لڑکی نے بھی ایسا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس کا پسینہ بھی چوٹی سے ایڑیوں تک بہ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ہم دونوں نان سموکر تھے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سگریٹ پینے کی لت لگی ہوتی ہے، وہ ایسے موقعوں پر گھبرا کر اس بات کا لحاظ کرنے کے بغیر کہ وہاں پر موجود دوسرے لوگ سموکر ہیں یا نان سموکر فوراً سگریٹ سلگا لیتے ہیں۔

بجلی کی بحالی کے انتظار سے توجہ بٹانے کے لئے میں نے اسے بتایا کہ میں

پہلی بار مصر آیا تھا، اور یہ کہ مجھے قاہرہ، جہاں پر میں تین روز سے ٹھہرا ہوا تھا، بہت پسند آیا تھا۔ لوگ بے حد متواضع تھے اور جس کسی کے ساتھ مجھے بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا، اس نے سب سے پہلے مجھے مرحبا کہا تھا اور پوچھا تھا کہ مجھے اس کا ملک کیسا لگا تھا۔ اگر میں کسی سے عربی میں بات کرتا تھا، تو لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہتی تھی۔ وہ فوراً میری زبان دانی کی تعریف کرنے لگتے تھے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے عربی بولنے کی کچھ ایسی مشق نہیں ہے، البتہ میں عربی زبان کو سہولت کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ مصر میں چند ماہ کے قیام کے دوران بولنے کی زبان بھی بخوبی سیکھ جاؤں گا۔

اس کو میری باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہ لگتی تھی، اس لئے یہ گفتگو بہت حد تک یک طرفہ رہی۔ میں نے دو چار سوالات بھی کئے، مگر وہ ہوں ہاں سے آگے نہ بڑھی۔ اسے دراصل جلد از جلد لفٹ کی قید سے نجات حاصل کرنے کی فکر تھی۔ یوں بھی پسینے کے سبب اس کے میک اپ کا ستیاناس ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے پندرہ بیس منٹوں میں بجلی آئی اور ہمیں لفٹ سے نجات ملی۔

کانفرنس ہال میں ہماری طرح بعض دوسرے لوگ بھی وقت پر نہ پہنچ پائے تھے۔ اس وجہ سے کانفرنس کا افتتاح ایک گھنٹے کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ لڑکی، جس کے نام سے میں بدستور ناواقف تھا، اپنے میک اپ کو سنوارنے کے لئے اوپر پہنچتے ہی باتھ روم میں غائب ہو گئی تھیں۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس کو کسی قسم کا میک اپ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر واضح ہے کہ انسان کو فیشن کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں دخل اندازی کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ یوں بھی مردوں کی سمجھ میں ایسی باتیں کم ہی آتی ہیں۔

کانفرنس ہال میں ہماری سیٹیں آمنے سامنے تھیں۔ اس کے نام کی تختی پر سمیہ جمال لکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ نام نہایت مناسب لگا۔ مرقع جمال تو وہ یوں بھی تھی، پھر سمیہ نام میں موسیقی بھری ہوئی تھی۔ میرے کان کانفرنس کی کارروائی کی طرف لگے ہوئے تھے اور آنکھیں سمیہ کے حسن کے راز کا کھوج لگانے میں گم تھیں۔ میری مصروفیت اس شغل میں ایسی تھی کہ جب میرا نام پکارا گیا، تو مجھے احساس تک نہ

ہوا کہ مجھ سے کانفرنس کا افتتاحی مقالہ پڑھنے کو کہا جا رہا تھا۔ سمیہ نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے صدر مجلس کی طرف متوجہ کیا۔

وقفے کے دوران میں نے سمیہ کا شکریہ ادا کیا، کیونکہ اس کے اشارے نے مجھے شرمندگی سے بچا لیا تھا۔ اس نے لفٹ میں اپنے رویہ کی معذرت کی اور پوچھا کہ میں کب تک مصر میں ٹھہروں گا۔ اسے اس بات کا علم صدر مجلس کے تعارفی ریمارکس سے ہوا تھا کہ مجھے اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے نے قاہرہ بھجوایا تھا، جہاں پر مجھے مختلف اداروں کے کام کا جائزہ لینا اور ان کے لئے بطور مشیر کے کام کرنا تھا۔ اتفاق سے جس ادارے میں میرا ہیڈ کوارٹر بننا تھا، اس میں سمیہ کام کرتی تھی۔ یہ انکشاف میرے لئے بے حد دلچسپی کا باعث تھا، کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے قاہرہ میں قیام کے دوران سمیہ کی صحبت حاصل رہے گی۔

انسان کی بعض خواہشیں شاید جذبے کی شدت کے سبب پوری ہو جاتی ہیں؛ چنانچہ یہی ہوا اور سمیہ کو اس کے ادارے کی طرف سے میرا اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا اس طرح ہمارا بہت سا وقت اکٹھا گذرنے لگا۔ میرا روز کا پروگرام بنانا اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہی میرے لئے دوسرے اداروں اور سرکاری محکموں سے اپوائنٹمنٹ لیتی تھی، اور ہر جگہ پر ساتھ جاتی تھی۔ ابتدائی دنوں کا حجاب آہستہ آہستہ اٹھنے لگا اور ہم آپس میں تھوڑا بہت ہنسی مذاق بھی کرنے لگے۔ مگر ہمارے درمیان ایک غیر مرئی دیوار بدستور قائم تھی، جس کو پھلانگنے کی میں نے کبھی جرأت نہ کی۔ ایک روز سمیہ نے خود ہی پوچھ لیا کہ میری شامیں کیسے گزرتی ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں شام سے کچھ پہلے لمبی سیر کو نکل جاتا ہوں، جس کی منزل اکثر شہر کا کوئی نہ کوئی کتاب گھر ہوتی ہے، جہاں پر میں کتابوں کی الٹ پلٹ میں اس وقت تک لگا رہتا تھا، جب تک دوکان کے کارندے بجلی کا سوئچ آف نہیں کر دیتے۔ تقریباً ہر روز ایک آدھ نادر کتاب ہاتھ لگ جاتی ہے۔ میرا کمرہ دھیرے دھیرے ایک لائبریری میں منتقل ہوتا جا رہا ہے۔

میرا قیام ان دنوں برج ہوٹل میں تھا، جو دریائے نیل کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کا افتتاح ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ ایئر کنڈیشننگ کام کرتی تھی اور ہر لحاظ

سے اس کا اسٹینڈرڈ قابل قبول تھا ۔ کھانا بھی اچھا ملتا تھا ، اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ میں وہاں سے پیدل چل کر اندرون شہر پہنچ سکتا تھا ، جہاں پر کتابوں کی دوکانیں پائی جاتی تھیں ۔ سمیہ نے کہا کہ میں جزیرہ کلب کا ممبر کیوں نہیں بن جاتا ، جو میرے ہوٹل سے بمشکل ایک کلو میٹر کے فاصلے پر زمالک میں واقع تھا ۔ خود اس کی پوری فیملی اس کی ممبر تھی ۔ میں نے اس وقت تک جزیرہ کلب کو ، جس کے ارد گرد اونچی باڑ لگی ہوئی تھی ، صرف ایک بار اندر سے دیکھا تھا ۔ اقوام متحدہ کے شناختی کارڈ نے میرے لئے کلب کے دروازے کھول دیئے تھے ، مگر چونکہ میں وہاں پر کسی کو نہ جانتا تھا ، اس وجہ سے کسی سے بات کرنے کے بغیر گھوم پھر کر باہر نکل گیا تھا ۔ البتہ میں نے دیکھا تھا کہ وہاں پر کھیلوں کا خاطر خواہ انتظام موجود تھا ۔ اس روز تالاب میں پیراکی کا مقابلہ ہو رہا تھا ۔ باسکٹ بال ، بیڈ منٹن اور کروکے کے کورٹ کھیلنے والوں سے بھرے ہوئے تھے ۔ اس کے علاوہ ہاکی اور فٹ بال کے میدانوں میں تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے ۔ کلب کی بلڈنگ میں ریستوران پایا جاتا تھا ، جس کا لان لوگوں سے بھرا ہوا تھا ۔ ایسی جگہوں پر جانے کا مزا دراصل دوستوں کی معیت میں آتا ہے ۔ سمیہ نے کہا کہ اس کا خاندان ہر جمعہ کے روز وہاں پر جاتا ہے ۔ اگر میں اس روز آؤں ، تو مجھے دوستوں کی کمی کا احساس نہ ہو گا ۔

اس روز سمیہ کے خاندان نے اتنی کرسیوں پر قبضہ کر رکھا تھا ، جیسے کسی برات کے اترنے کا انتظام کیا گیا ہو ۔ پتہ چلا کہ سب لوگ یہی کرتے تھے ۔ جمعہ کے جمعہ دور و نزدیک کے رشتہ دار اور دوست یار وہاں پر اکٹھے ہوتے ، مل کر کھاتے پیتے اور دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے ۔ مرد ان میں اکا دکا ہی تھے اور ایک کونے میں علیحدہ بیٹھے ہوئے سیاسیات پر باتیں کر رہے تھے ۔ پھر وہ لوگ اٹھ کر کسی اور طرف چلے گئے ۔ شاید کلب کا کوئی خفیہ پب ہو گا ، جہاں پر انہیں بیئر یا دوسری مشروبات ملتی ہوں گی ۔ جب کہ اس جگہ پر ، جہاں پر ہم بیٹھے ہوئے تھے ، صرف چائے اور کافی دی جاتی تھیں ۔ سمیہ کی سہیلیاں بھی ادھر آن نکلیں ، جن کے ساتھ اس نے میرا تعارف کرایا ۔ ان کی محفل بھی بوڑھیوں سے ذرا ہٹ کر لگی ہوئی تھی ۔ لڑکیاں بے چینی کے ساتھ اپنے بھائیوں ، چچیروں اور دوسرے عزیزوں کا انتظار کر رہی تھیں ،

جنہیں اس روز کلب کے کروکے چیمپین شپ میں حصہ لینا تھا۔ البتہ انہیں خطرہ تھا کہ ان کا ایک کھلاڑی شاید اس روز نہ آسکے گا۔ اسے تین چار روز سے بخار آرہا تھا اور ڈاکٹر نے اس کو گھر سے باہر جانے کی ممانعت کر رکھی تھی۔

سمیہ کا بھائی عصام اپنے دو دوستوں کے ساتھ پہنچا، تو پتہ چلا کہ ان کا خدشہ درست نکلا تھا۔ فہمی کو آنے کی اجازت نہ ملی تھی۔ اس طرح ان کی ٹیم ایک کھلاڑی کی کمی کے باعث چیمپین شپ میں حصہ نہ لے سکے گی۔ کروکے میں یوں تو ہر کھلاڑی فرداً فرداً کھیلتا ہے، مگر جزیرہ کلب میں یہ اصول رائج تھا کہ چار کورٹوں میں بیک وقت چار ٹیموں کا ایک ایک کھلاڑی میچ میں حصہ لیتا تھا۔ چاروں میچوں کے جیتنے والوں اور رنراپ کو کوارٹر فائینل میں لیا جاتا تھا۔ اور سمی فائینل میں دونوں میچوں کے جیتنے والے اور رنراپ حصہ لیتے تھے۔ فائینل میں صرف دو کھلاڑی باقی رہ جاتے تھے، جن کے درمیان چیمپین شپ کا میچ ہوتا تھا۔ سمیہ نے مجھے ٹیم کا ممبر بنانے کی تجویز پیش کی۔ اسے پتہ تھا کہ میں نے انگلستان میں کروکے کھیلنا سیکھا تھا اور اس کی تھوڑی بہت سدھ بدھ رکھتا تھا۔

حسن اتفاق سے مجھے جس گروپ میں رکھا گیا، وہ لوگ میری طرح اناڑی تھے۔ بلکہ میرا کھیل ان سے بہتر تھا۔ میں آسانی کے ساتھ میچ جیت گیا۔ دوسرے اور تیسرے میچ میں مقابلہ قدرے سخت تھا، مگر مقامی کھلاڑیوں کی آپس کی دشمنی میرے کام آگئی۔ انہوں نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے ایک دوسرے کے رستے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ میں اس دوران میں اپنا کھیل کھیلتا رہا اور بالآخر جیت گیا۔ میں اپنی ٹیم کا واحد ممبر تھا، جو چیمپین شپ کے فائینل تک پہنچا تھا۔ البتہ آخری میچ میں نے اپنے اناڑی پن کے ہاتھوں ہار دیا۔

اس دن سے عصام اور اس کے دوستوں نے مجھے اپنے گروپ میں شامل کر لیا بلکہ وہ اپنی ٹیم کے فائینل تک پہنچنے کا جشن منانے کے لئے مجھے شہر کی ایک بار میں لے گئے، جو میدان فرحت باشا میں نئی نئی کھلی تھی اور جس کا ان دنوں بہت چرچا تھا، اس زمانے میں ابھی قاہرہ کے ریستورانوں میں ویٹر عورتیں نہ ہوتی تھیں۔ اس کی ابتداء اس بار سے ہوئی تھی۔ ویٹر عورتوں کے ہاتھ سے چائے کا کپ یا کوکا کولا کا

گلاس پینے کا لئے شہر بھر کے بے فکرے شام کو وہاں پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ عصام اور اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ اگر لڑکیوں کو پیسے کا لالچ دیا جائے، تو وہ شاید رات بھر کے لئے ہوٹل میں ساتھ چلنے کو بھی تیار ہو جائیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایسا ہوٹل کہاں سے پیدا کیا جائے، جہاں پر غیر شادی شدہ جوڑے کو کمرہ مل سکتا ہو۔ پولیس کی چیکنگ بے حد کڑی ہوتی تھی اور ہوٹلوں پر ان زمانے میں سخت پابندیاں تھیں۔

باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی آگیا کہ مجھے ایک فلیٹ کی تلاش تھی۔ ہوٹل کی زندگی سے میں تنگ آگیا تھا، کیونکہ میرا کمرہ بے حد چھوٹا تھا۔ اور پھر مجھے وہاں پر ویسی آزادی حاصل نہ تھی، جیسی آدمی کو اپنے فلیٹ میں ہوتی ہے۔ میں نے دو ایک کرائے کے فلیٹ دیکھے تھے، مگر وہ مجھے پسند نہ آئے تھے۔ عصام نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کرے گا۔ اس کا کوئی واقف کار حکومت کے محکمہ مکانات میں ملازم تھا۔

چنانچہ اگلے ہی ہفتے اس نے میرے لئے زمالک میں ایک فلیٹ کا انتظام کر دیا۔ عصام کے دوست نے بہت عمدہ فرنیچر اور چائنا کراکری مہیا کر دی، بلکہ ساتھ ہی ایک ملازمہ بھی ڈھونڈ دی۔ یہ فلیٹ ایک ایسے مکان میں تھا، جہاں پر صرف غیر ملکی رہتے تھے۔ اس وجہ سے حکومت کا محکمہ مکانات اس کی دیکھ بھال پر خاص توجہ دیتا تھا۔ عصام کا دوست کانٹریکٹ کے کاغذات لے کر خود میرے کمرے میں آگیا اور دستخط کرا کے لے گیا۔ اس سے اگلے روز عصام مجھے مکان کی دو چابیاں دے گیا۔ اپنے دوستوں کے تعاون سے اس نے میرا اسامان ہوٹل سے فلیٹ میں منتقل کیا۔ صبح سویرے ملازمہ رشیدہ حاضر ہو گئی۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے پچاس کی لگتی تھی، مگر چلنے پھرنے میں ایسی چست تھی، جیسے تیس کی بھی نہ ہو۔ اس نے بتایا کہ اس کے آٹھ بچے ہیں اور چونکہ اس کا مرد نکما ہے، اس لئے خاندان کا گزارہ رشیدہ کی آمدنی پر ہوتا ہے۔ یہ بپتا سن کر میں نے اس کی تنخواہ بڑھا دی۔ رشیدہ کوری ان پڑھ تھی، مگر گنتی جانتی تھی۔ پہلے روز میں اس کے ساتھ خود مارکیٹ میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھاؤ کرنے میں خوب مہارت رکھتی تھی۔ کھانا بھی اچھا پکاتی تھی اور صفائی ستھرائی کا

خیال رکھتی تھی۔ میرے لئے اسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ صبح کا ناشتہ میں اس کے آنے سے پہلے کر لیتا تھا۔ میرے دفتر جانے کے بعد وہ فلیٹ کی صفائی کر کے سودا سلف خریدنے چلی جاتی تھی۔ دھلنے والے کپڑے دھوبی آکر لے جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دوپہر کا کھانا پکا کر اور اوون میں رکھ کر گھر چلی جاتی تھی۔ میں دو بجے کے بعد گھر لوٹتا تھا اور کھانا کھانے کے بعد ایک دو گھنٹے سوتا تھا۔ پھر شام کے قریب گھومنے پھرنے کے لئے نکل جاتا تھا اور کھانا باہر ہی کھاتا تھا۔ ہفتے میں ایک دو بار عصام اور سمیہ کے دوستوں سے ملنے کے لئے کلب میں چلا جاتا تھا۔ ویک اینڈ پر وہ لوگ اکثر مجھے اپنی پارٹیوں میں ساتھ لے جاتے تھے، جہاں پر دل کھول کر شراب پی جاتی تھی، یورپی موسیقی کے ریکارڈ سنے جاتے تھے اور ڈانس ہوتا تھا۔ البتہ لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں الگ الگ رہتی تھیں۔ بھائی اپنی بہنوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ یوں بھی ان دنوں ابھی کھلے بندوں چوما چاٹی کا رواج نہ تھا۔

ایک روز میں دفتر سے لوٹا، تو باتھ روم میں دو گیلے تولیے لٹک رہے تھے۔ مہمان خانے کے بستر کی چادر چڑی مڑی ہوئی تھی اور کسی نے میرے سلیپر استعمال کرنے کے بعد بد احتیاطی کے ساتھ کمرے میں ایک طرف پھینک دیئے تھے۔ اوون میں سے کھانا غائب تھا۔ باورچی خانے میں ان دھلی پلیٹیں، گلاس اور چائے کی پیالیاں اور بیئر کی خالی بوتلیں دھری تھیں۔

رشیدہ نے اگلے روز قسم کھائی کہ اس کی موجودگی میں کوئی شخص فلیٹ میں نہیں آیا تھا۔ البتہ وہ نہیں جانتی کہ اس کی غیر حاضری میں کیا ہوتا رہا تھا۔ جو کوئی بھی آیا تھا، بہر صورت چور نہیں تھا، کیونکہ فلیٹ میں سے وہ کوئی چیز چرا کر نہیں لے گیا تھا۔ پھر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی، جو جاتے ہوئے اپنے ہیر پن میز پر بھول گئی تھی۔ رشیدہ نے کہا کہ مکان کا بواب نہ ہو، تو ایسی باتوں کا ہونا عجب نہیں ہوتا۔ مصری مکانوں کے دروازے پر عام طور سے ایک ملازم بیٹھا رہتا ہے، جو بواب کہلاتا ہے۔ وہ کسی ایرے غیرے کو عمارت میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ اس کے علاوہ وہ مکان کے باسیوں کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا ہے، ہمارے مکان میں چونکہ سب غیر ملکی رہتے تھے، اس لئے بواب کا رکھنا ضروری نہ سمجھا

گیا تھا۔ پھر اگر کوئی بواب ہوتا بھی تو لوگ اس کے ساتھ کس زبان میں بات کرتے ۔ان میں سے کسی کو عربی نہیں آتی تھی ۔رہے گھروں میں کام کرنے والے ملازم، تو رشیدہ کی طرح انہوں نے دو چار الفاظ یورپی زبانوں کے سیکھ رکھے تھے۔ان کی مدد سے کام چل جاتا تھا۔رشیدہ کا غیر ملکی زبانوں کا کل سرمایہ شاید درجن بھر الفاظ سے زیادہ نہ تھا۔ مجھ سے وہ عربی میں بات چیت کرتی تھی اور میری کتابی عربی پر دل کھول کر ہنستی تھی۔جو بات میں دو تین فقروں میں بمشکل ادا کرتا تھا، اسے وہ مصری لہجہ میں، جسے الدارجہ کہتے ہیں، ایک فقرے میں سمو دیتی تھی۔اس طرح وہ خادمہ ہونے کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے میری استانی بھی بنتی جا رہی تھی۔

اگلے تین ہفتوں کے دوران دو بار میری غیر حاضری سے فائدہ اٹھایا گیا۔ ایک بار سوموار کو اور دوسری بار جمعرات کو، اس وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اگلی بار کس روز میرے فلیٹ کو شرف مہمانی دیا جائے گا۔البتہ تینوں بار پیٹرن ایک جیسا تھا۔فلیٹ کی کوئی چیز چوری نہ کی گئی، سوائے اس کے کہ میرا اس روز کا کھانا غائب ہو جاتا رہا اور باورچی خانہ میں باسی برتنوں کے ڈھیر لگے ہوتے تھے اور باتھ روم پانی سے جل تھل ہوتا تھا، جیسے آدمی نہیں گینڈے ٹب میں غوطے لگاتے رہے ہوں۔فلیٹ کی فضا سگریٹوں کے دھویں کے سبب ناقابل برداشت ہوتی تھی، جب کہ میں باسی دھویں سے الرجک ہوں۔

ایک روز اتفاق سے میں اپنے معمول کے خلاف وقت سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ دروازہ کھولتے ہی سگریٹ کے دھویں نے میرا استقبال کیا۔ مہمان خانہ کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا اور وہیں سے دھواں نکل رہا تھا۔میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ان بن بلائے مہمانوں کے تخلیے میں مداخلت کروں یا نہ کہ عصام نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔وہ آدم زاد ننگا تھا۔مگر مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بالکل نہ جھینپا۔جلدی سے اس نے بستر کی چادر کھینچ کر اپنے گرد لپیٹ لی اور اپنے پیچھے دروازے کا پٹ بند کر کے میرے پاس آگیا۔اس نے کہا کہ وہ اس بارہ میں مجھ سے بعد میں بات کرے گا۔اس وقت میں اسے بس خاموشی سے جانے دوں، وگرنہ اس کی لڑکی کے سامنے سخت سبکی ہو جائے گی۔مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا،

مگر میری شرط یہ تھی کہ وہ فلیٹ کی چابی جانے سے پہلے میرے حوالے کرتا جائے۔

اس کے بعد بہت دنوں تک عصام سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ بلکہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ مجھ سے کنی کاٹ رہا تھا۔ سمیہ نے کہا کہ اسے ان دنوں میں اپنے کاروبار سے بالکل فرصت نہ ملتی تھی۔ دو تین ہفتوں تک وہ کلب میں بھی نہ آیا، جہاں پر اس کے دوست یار مجھ سے آن آن کر اس کے بارہ میں پوچھنے لگے۔ ایک روز وہ مجھے شہر میں مل گیا اور اصرار کر کے ایک کیفے میں لے گیا، جہاں پر اتفاق سے اس کا کوئی جاننے والا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں اپنے پاس بلا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اس بارہ میں کوئی بات نہ کر سکے، جس کی وجہ سے عصام مجھ سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ رخصت کے وقت اس نے کہا کہ وہ بہت جلد میرے گھر آئے گا۔

چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد وہ میرے گھر پر آیا، مگر میری غیر حاضری میں۔ اب کے میرے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا گیا۔ باورچی خانے اور باتھ روم میں بھی انہوں نے ہر چیز کو صاف ستھرا چھوڑا۔ ان کی آمد کا پتہ مجھے گیلے تولیے سے چلا۔ اگر تولیہ چغلی نہ کھاتا، تو مجھے کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ عصام نے اب کے سگریٹ نوشی سے پرہیز کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے دوست کے ذریعہ نئی چابی بنوا لی تھی۔ اس واقعہ کے بعد میرے لئے اس فلیٹ سے نقل مکانی کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

نیا فلیٹ مجھے مضافاتی قصبہ المعادی میں ملا، جہاں پر میرا دفتر تھا۔ یوں بھی وہ علاقہ بے حد سرسبز اور کشادہ تھا۔ مکان نیا تھا اور فلیٹ کا فرنیچر فیشن ایبل تھا۔ البتہ رشیدہ کے گھر کا راستہ زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔ اس کو بس اور سٹی ٹرین میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اس کو روز کے لئے آنے جانے کا کرایہ اور کچھ زائد تنخواہ کا لالچ دے کر راضی کر لیا۔ وہ بھی میری طرح ان بن بلائے مہمانوں سے تنگ آ چکی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اس سلسلہ میں کبھی عصام کا نام نہ لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ جان چکی تھی کہ وہ اسی کی کارستانی تھی۔ رشیدہ اسے اول درجہ کا اوباش سمجھتی تھی اور مجھے اشاروں کنایوں میں اس سے بچ کر رہنے کا مشورہ دیتی رہتی تھی۔

میں نے نئے فلیٹ میں نقل مکانی کے لئے عصام اور اس کے دوستوں سے کوئی مدد نہ لی۔ مگر ان لوگوں کو ہاؤس وارمنگ پارٹی میں شمولیت سے نہ روکا جا سکتا

تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو وجہ بتانی پڑتی، جس کے سبب بدمزگی پیدا ہوتی۔ میں یوں بھی سمیہ کے سامنے عصام کا پول نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ اور اس بات کا اب کوئی خطرہ نہ تھا کہ عصام میرے نئے فلیٹ کو اپنی فتوحات کے لئے استعمال کر سکے گا۔ نئے مکان میں بواب موجود تھا، جس کی ذمہ داریوں میں یہ امر شامل ہے کہ وہاں پر رہنے والوں کے فلیٹوں میں کوئی غیر آدمی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ رشیدہ میری حلیف تھی۔ اس نے دعوت والے روز چابیاں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں اور مجھے بھی خبردار کر دیا کہ میں اپنی چابی کسی کو دیکھنے کے لئے بھی نہ دوں۔

عصام اور اس کے دوستوں کے ہاتھ فلیٹ کی چابیاں تو نہ لگیں، مگر ان کو ایک دوسرا خزانہ مل گیا۔ بالمقابل والے مکان میں میرے فلیٹ سے ایک منزل نیچے ایک فیملی رہتی تھی، جس کی چار جوان بیٹیاں تھیں، جو صحیح معنوں میں ایک سے ایک بڑھ کر جو بن پر تھیں۔ چاروں ناشتے کے وقت سے لے کر دن ڈھلنے تک، جب انہیں کلب میں جانا ہوتا تھا، بالکنی کی زینت بنی رہتی تھیں۔ دوپہر تک تو وہ شب خوابی کا لباس تبدیل نہ کرتی تھیں، جس میں سے ان کی جوانی ابل ابل پڑتی تھی۔ عصام اور اس کے دوستوں کو یہ نظارہ اس قدر بھایا کہ انہوں نے اپنی محفل بالکنی پر ہی لگا لی، بلکہ لڑکیوں سے اشارہ بازی کرنے لگے۔ سمیہ اور اس کی سہیلیاں اس بات پر جزبز ہوئیں، مگر بھائیوں کو روکنا ٹوکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مجبوراً مجھے انہیں بالکنی سے ہٹانا پڑا۔ میں نے انہیں کہا کہ لڑکیوں کا باپ پولیس آفیسر ہے۔ اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔

شام کے کھانے کا انتظام میں نے المعادی کلب میں کر رکھا تھا، جو میرے مکان کے پڑوس میں واقع تھا۔ وہاں پر وہ چاروں لڑکیاں بھی آن نکلیں، بلکہ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کیا میں برتھ ڈے پارٹی دے رہا ہوں۔ اور اگر ایسا ہے، تو میں نے انہیں کیوں دعوت نہیں دی؟ میں نے کہا کہ وہ خوشی سے ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں۔ عصام اور اس کے دوستوں کی تو عید ہو گئی۔ وہ اتنی جلدی لڑکیوں کے ساتھ گھل مل گئے، جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ لڑکیوں نے اگلے ویک اینڈ پہ اسکندریہ چلنے کی تجویز پیش کی۔ عصام کی ٹولی فوراً تیار

ہو گئی ۔اب سوال یہ تھا کہ لڑکیوں کے باپ سے کیسے اجازت لی جائے ۔ میں چونکہ ان سب سے عمر میں بڑا تھا اور لڑکیوں کا باپ مجھ پر اعتبار کرتا تھا، اس لئے مجھے اس سے اجازت لینے کو کہا گیا۔ جس کا مطلب یہ بنتا تھا کہ مجھے لڑکیوں کی حفاظت کی ضمانت دینی ہوگی ۔ سمیہ نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے ہامی بھرنے سے روک دیا، اس طرح اسکندریہ کی ٹرپ کا معاملہ تو ٹھپ ہو گیا، مگر میرا گھر آئندہ دنوں میں عصام اور اس کے دوستوں کا اڈا بن گیا۔ لڑکیاں بھی ایک سے ایک حرافہ تھیں، وہ کسی نہ کسی بہانے میرے گھر آن نکلتی تھیں ۔ رشیدہ نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ معاملہ ہاتھ سے نہ نکلنا چاہیئے ۔

میں اس سلسلہ میں سمیہ سے مدد کا خواہستگار ہوا۔ اس نے کہا کہ اسے عصام اور اس کے دوستوں پر کوئی اعتبار نہیں ہے ۔ وہ لوگ جزیرہ کلب میں پہلے بھی گڑ بڑ کر چکے ہیں ۔ جس کی وجہ سے ان کا داخلہ کلب میں بند کیا جانے والا تھا۔ مگر اس کے باپ نے مل ملا کر بات کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ کلب کی ایک لڑکی کو عصام سے حمل ہو گیا تھا۔ جسے بعد میں گرانا پڑا، کیونکہ عصام اس لڑکی سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ مصریوں کے رواج کے مطابق ایک باکرہ بیوی چاہتا تھا، جو وہ لڑکی اب نہ تھی ۔

انہیں دنوں میں اوتا نے اطلاع دی کہ اس نے ڈاکٹریٹ کا امتحان پاس کر لیا تھا اور ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق دو ماہ کے لئے میرے پاس مصر آ رہی تھی ۔ اوتا کی آمد کے بعد عصام اور اس کے دوستوں کا ہمارے گھر آنا بند ہو گیا ۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ اوتا کی موجودگی میں ان کی دال نہیں گل سکتی تھی ۔ لڑکیاں یوں بھی اوتا سے دبتی تھیں ۔ اس طرح میرے لئے یہ مسئلہ احسن طریق سے حل ہو گیا۔ مجھے کسی کو روکنا نہیں پڑا اور نہ ہی مجھے لڑکیوں کے باپ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑی ۔ البتہ اوتا کی موجودگی کے سبب سمیہ آزادی کے ساتھ ہمارے گھر آنے لگی ۔ دونوں کی آپس میں خوب بنتی تھی ۔ سمیہ کو جرمن بولنے کا شوق تھا۔ اس نے قاہرہ کے جرمن اسکول میں تعلیم پائی تھی اور اچھی خاصی جرمن بول لیتی تھی ۔ البتہ مجھ سے وہ شروع سے انگریزی میں بات کرتی تھی ۔

اوتا کی زبانی مجھے سمیہ کے دوست کا پہلی بار پتہ چلا ۔ دونوں امریکن یونیورسٹی میں کلاس فیلو رہے تھے ۔ وہ اپنے باپ کی فیکٹری میں مینجر تھا اور سمیہ سے شادی کرنی چاہتا تھا ۔ مگر مشکل یہ تھی کہ فلپ ایک قبطی خاندان سے تھا ، جب کہ سمیہ مسلمان تھی ۔ اور اگرچہ سمیہ کا باپ بہت زیادہ مذہبی نہیں تھا ، تاہم سمیہ جانتی تھی کہ وہ کبھی ایک عیسائی داماد کو قبول نہیں کرے گا ۔ جب کہ سمیہ کی ماں بالکل دوسرے خیال کی تھی ۔ اس بارہ میں اس کی بات اوتا کے ساتھ ہوئی ، تو اس نے کہا کہ اگر اوتا ایک مسلمان کے ساتھ شادی کر سکتی ہے ، تو اس کی بیٹی کیوں ایک عیسائی کے ساتھ بیاہ نہیں رچا سکتی ۔

سمیہ نے ہماری ملاقات فلپ کے ساتھ بھی کرائی ۔ وہ خاصا سمارٹ اور خوش شکل نوجوان تھا ۔ اس نے کہا کہ وہ سمیہ کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کرنے کو تیار ہے ' مگر اس صورت میں اس کا باپ اسے عاق کر دے گا ۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے اور انہیں کسی قیمت پر دکھ نہیں پہنچانا چاہتا ۔ دوسری طرف وہ سمیہ سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اس کی خاطر عیسائیت کو قبول کر لے ۔ دونوں جانتے تھے کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ان کو شادی کی اجازت نہیں دی جائے گی ۔ انہیں اس مسئلہ کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا ، سوائے اس کے کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسرے ملک میں ہجرت کر جائیں ، جہاں پر مذہبوں کا دھندا ان کے پیار کے راستے میں روک نہ بن سکے ۔

مصر میں میرے مشن کے اختتام پر اسکندریہ میں ایک کانفرنس بلائی گئی ، جس میں تمام متعلقہ اداروں کے سربراہوں کو شمولیت کی دعوت دی گئی ، جن کے کام کا میں نے جائزہ لیا تھا ۔ اس کانفرنس کی تیاری کا سارا بوجھ سمیہ کے سر پر تھا ۔ اس نے اسکندریہ میں سابق شاہ فاروق کے محل کے باغ میں واقع فلسطین ہوٹل میں رہائش اور کانفرنس کا انتظام کیا ۔ یہ جگہ عین سمندر کے کنارے واقع ہے اور شہر کی گہما گہمی سے دور ہے ۔ محل کے گرداگرد ایک لمبا چوڑا پارک ہے ، جسے ایک فصیل نما دیوار کے ذریعے باہر کی دنیا سے کاٹ دیا گیا ہے ۔ گیٹ پر پولیس کی چوکی بیٹھی رہتی ہے ، جو صرف ان لوگوں کو اندر آنے دیتی ہے ، جو فلسطین ہوٹل میں مقیم

ہوتے ہیں یا وہاں پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں حصہ لے رہے ہوتے ہیں۔
اکثر لوگ مقررہ تاریخ سے پہلی شام تک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ البتہ کانفرنس کا افتتاح اگلے روز دس بجے ہونا تھا، جس کی خاطر ایک وزیر خاص طور پر قاہرہ سے آ رہا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد موسیقی کی محفل رکھی گئی تھی، جس میں شامل ہونے کی پابندی نہ تھی۔ سمیہ کھانے کے فوراً بعد غائب ہو گئی۔ یوں بھی اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ ہوٹل کی کانفرنس سیکرٹیریٹ نے باقی کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ میرا دل موسیقی اور ڈانس سے جلد ہی اکتا گیا اور میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔
اگلی صبح میں شیو کرنے اور نہانے دھونے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف عصام تھا، جو پولیس کی فصیل والی حفاظتی چوکی سے بول رہا تھا۔ اسے اندر داخل ہونے کے لئے اجازت درکار تھی، جو میرے کہنے پر اسے دے دی گئی۔ میں اس کی آمد پر بے حد حیران ہوا، کیونکہ کانفرنس سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے آتے ہیں سمیہ کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ اگر وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے، تو ناشتے کے ہال میں ہو گی۔ وہ وہاں پر نہ تھی اور اس کا کمرہ بند تھا۔ اس کی چابی ریسپشن میں لٹک رہی تھی۔ عصام نے کہا کہ وہ ساری رات تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اسے فون کرتا رہا تھا۔ اگر اس نے رات ہوٹل میں گذاری ہوتی تو کبھی تو فون کو اٹھاتی۔ وہ بہت غصہ میں تھا اور سمیہ کو "بنت حرام" کہہ کر کوس رہا تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ہوٹل سے باہر پورچ میں جا کر کھڑے ہوئے، جہاں پر میں نے سمیہ کو فلپ کی کار سے اترتے ہوئے دیکھا۔ عصام نے بھی شاید فلپ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھاگ کر سمیہ کی طرف جانا چاہتا تھا، مگر میں اسے پکڑ کر اندر ہوٹل میں لے گیا۔ سمیہ نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی چابی لے کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آدھ پون گھنٹہ بعد نہا دھو کے وہ نیچے اتری، تو عصام کو ہال میں میرے ساتھ کھڑا دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اس نے کہا کہ وہ اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ اسے صبح اٹھتے اٹھتے دیر ہو گئی تھی۔ عصام نے کہا کہ وہ ساری رات اس کے کمرے میں فون کرتا رہا تھا، مگر کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ سمیہ نے کہا کہ اس کے

کمرے کا فون خراب ہے۔ اسی وجہ سے وہ کل شام وہاں سے ماما سے بات نہ کر سکی تھی۔ اسے ہال میں پبلک فون بوتھ سے گھر فون کرنا پڑا تھا۔ ہم انہیں باتوں میں مصروف تھے کہ کانفرنس کے افتتاح کا وقت ہو گیا اور مجھے انہیں ناشتے کی میز پر چھوڑ کر ادھر جانا پڑا۔

سمیہ بعد میں مجھے کانفرنس ہال میں یا کھانے کے وقت ڈائننگ روم میں کہیں پر نظر نہ آئی۔ شاید وہ عصام کے ساتھ ہوٹل سے باہر چلی گئی تھی۔ میں نے ریسپشن میں اس کے بارہ میں پوچھا، تو بتایا گیا کہ وہ اپنے بھائی سمیت ایک موٹر بوٹ لے کر باہر سمندر کی طرف نکل گئی تھی۔ میں اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد دوبارہ کانفرنس ہال میں چلا گیا، جہاں پر کانفرنس کی کاروائی شام کے کھانے تک جاری رہی۔ عصام اور سمیہ اس وقت تک واپس نہ لوٹے تھے۔ ریسپشن نے بتایا کہ انہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا، جس کی اطلاع تھوڑی دیر پہلے واٹر پولیس کی طرف سے ملی تھی۔ مگر ابھی مکمل تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ میں پریشانی کے عالم میں بھاگ کر ہوٹل کی پرائیویٹ بندرگاہ میں پہنچا، تو پولیس کی کشتی ایک موٹر بوٹ کو اپنے پیچھے کھینچتے ہوئے بندرگاہ میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے دور سے عصام کو پہچان لیا، جو اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں سمیہ کی لاش پڑی تھی۔ پولیس نے بتایا کہ سمندر میں اس روز لہریں بے حد خطرناک تھیں۔ سمیہ کشتی سے گر گئی تھی اور اس کا بھائی پوری کوشش کے باوجود اسے پانی سے زندہ نہ نکال سکا تھا۔ میں نے قریب سے دیکھا کہ سمیہ کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا اور سوج گیا تھا، جیسے کسی نے اس کو مکوں سے بے تحاشا مارا ہو۔ پھر میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی، تو میں نے دیکھا کہ دونوں کلائیوں پر ایک گہری لکیر پڑی ہوئی تھی، جیسے کسی نے اس کے ہاتھ رسی سے کس کے باندھ دیئے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سمیہ، جسے تیرنا خوب آتا تھا، اپنی جان نہ بچا سکی تھی۔ اس لمحے میرے ذہن میں عصام کے صبح کے کوسنے گونجنے لگے: "بنت حرام.... بنت حرام"۔

(اسکندریہ (مصر)۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ء)

خفیہ فائل

سیگریڈ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا اور خط لوٹ کر بھی نہیں آیا۔ شاید وہ جواب نہیں دینا چاہتی یا نہیں دے سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اس دوران میں پھر شادی کر لی ہو اور اس کے خاوند کو یہ امر پسند نہ ہو کہ وہ غیر مردوں سے خط و کتابت کرے، اگرچہ میں اتنا غیر بھی نہیں ہوں کہ مجھے چند سطروں کا خط نہ لکھا جا سکتا ہو۔ سیگریڈ کے لئے خیر میں غیر نہ سہی، مگر اس کے خاوند کے لئے میں بہر صورت غیر ہوں۔ اسے سیگریڈ نے یقیناً کچھ نہیں بتایا ہو گا۔ اور اگر بتایا ہو گا، تو صرف اس قدر کہ ہماری ملاقات اتفاقیہ طور پر ماسکو کے ہوائی اڈے پر ہوئی تھی۔ اور واضح ہے کہ یہ بات خط کا جواب دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اگر انسان ان سب لوگوں کو خط لکھنے لگے، جن کے ساتھ اس کی ملاقات ماسکو کے یا کسی دوسرے ہوائی اڈے پر بس یونہی سرسری طور پر ہوئی تھی، تو آدمی کے پاس کسی دوسرے کام کے لئے بالکل کوئی وقت باقی نہ بچے۔

آپ کو میں نے اب تک یہ تو بتایا ہی نہیں کہ سیگریڈ مشرقی جرمنی کی رہنے والی ہے۔ جس زمانے میں ہماری ملاقات ہوئی تھی، وہ خوبصورتی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ اس جیسی خوش شکل لڑکیاں فلمی رسالوں کے سر ورقوں پر تو نظر آ جاتی ہیں، مگر سچ مچ کی زندگی میں آدمی کی ان کے ساتھ ملاقات نہیں ہو پاتی۔ یہ بات مجھے اس وقت بھی سوجھی تھی، جب وہ ماسکو کے ہوائی اڈے پر قطار میں مجھ سے آگے کھڑی تھی۔ میرے پیچھے چار دوسرے مسافر تھے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ میرے خدشات کے برعکس مجھے ماسکو میں رات بسر نہیں کرنی پڑے گی۔ میں

عشق آباد سے آیا تھا، جہاں پر ایروفلوٹ کے کارندوں نے کہا تھا کہ میں اس شام تک ماسکو تو پہنچ جاؤں گا، مگر برلن والی پرواز نہ لے سکوں گا۔ چنانچہ ہمارا طیارہ دیر سے روانہ ہوا تھا۔ پھر مخالف ہواؤں کے سبب بیچارہ پروپیلر طیارہ اپنی مقررہ رفتار نہ پکڑ پایا تھا۔ اس روز دھچکے بھی ایسے لگے تھے کہ بہت سے مسافروں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ قے کر کر کے نڈھال ہو گئے تھے۔ جیسا کھانا ہمیں اس روز پیش کیا گیا تھا، ویسا کھانا میں نے اپنی زندگی میں کسی دوسرے ہوائی سفر کے دوران نہیں کھایا۔ ہر مسافر کو ایک چوتھائی فرائیڈ چکن، وائن کی ایک بوتل اور ایک سیب ٹرے میں رکھ کر دیئے گئے تھے۔ پہلے تو یہ بات مجھے بے حد مضحکہ خیز لگی، کیونکہ اس زمانے میں ہوائی کمپنیاں مینیو کا کھانا دیا کرتی تھیں۔ مگر جب طیارے نے ایک ایئرپاکٹ کی زد میں آکر کئی ہزار فٹ کا غوطہ لگایا اور میں بمشکل گرتے ہوئے سیب کو پکڑ پایا، تو میں نے جان لیا کہ ایروفلوٹ نے وہ کھانا اپنے تجربے کی بنا پر درست چنا تھا۔ میں نے تو خیر وائن کی بوتل کو اس خیال سے اپنے سفری بیگ میں ڈال لیا تھا کہ گھر پہنچ کر اپنے ایک ہمسائے کو تحفے میں دے دوں گا، جو روس اور کمیونزم کا دلدادہ تھا اور وہاں کی ہر چیز کو آسمانی نعمت سمجھتا تھا۔ مگر دوسرے مسافروں کی بوتلیں، سیب اور چکن قلابازیاں کھاتے ہوئے گرے تھے۔ بہتوں کے کپڑے شراب کے گرنے سے گیلے ہو گئے تھے۔ اور ہوائی جہاز میں الکحل کی بو پھیل گئی تھی۔ بیچاری ائرہوسٹسیں گیلے تولئے اٹھائے ہوئے مسافروں کے کپڑوں اور سیٹوں کو صاف کرنے میں لگ گئیں۔ وہ تو خیریت گذری کہ شراب کی بوتلیں سرخ وائن کی نہ تھیں، وگرنہ اس روز طیارہ روسی جھنڈے کی طرح سرخ رنگ سے رنگا جاتا۔

ماسکو ہم کافی لیٹ پہنچے تھے۔ برلن والی فلائٹ پرواز کے لئے تیار کھڑی تھی۔ بھاگ دوڑ کر کے میں متعلقہ کونٹر پر پہنچا، تو دیکھا کہ مسافروں کی شیطان کی آنت جتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ برلن کی دوپہر کی فلائٹ کینسل ہو گئی تھی اور اس فلائٹ کے مسافروں کو بھی اس جہاز میں جانا تھا، بلکہ ان لوگوں کو دوسرے مسافروں پر ترجیح دی جا رہی تھی۔ جب مجھ سے آگے کھڑی ہوئی خوبصورت لڑکی کی باری آئی، تو کونٹر بند کر دیا گیا، کیونکہ جہاز کی تمام سیٹیں پر ہو چکی تھیں۔ اب ہمیں

اگلے روز دوپہر کی فلائٹ پر سفر کرنا ہوگا۔ ہم سب نے احتجاج کیا، جو بے سود تھا، کیونکہ ہمارے جھگڑنے سے بھرے پُرے جہاز میں خالی سیٹیں تو نہیں نکل سکتی تھیں، میرے پیچھے جو شخص کھڑا تھا، وہ میری طرح مغربی جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس نے کہا کہ مشرقی جرمنی کی ایئر لائن انٹرفلوگ میں وہ اس کا آخری سفر تھا۔ پھر اس نے مجھ سے آگے والی لڑکی کے بارے میں کہا کہ اس کے لئے تو ضرور جہاز میں جگہ نکل سکتی ہے۔ بلکہ اس کو ایر ہوسٹس بنا کر بھی لے جایا جا سکتا ہے۔ اور اگر کوئی سیٹ خالی نہ ہوئی، تو وہ پائلٹ کی گود میں جا کر بیٹھ سکتی ہے۔

کونٹر بند کرنے سے پہلے ہمیں انٹر نیشنل کونٹر پر رپورٹ کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ ہمارا قافلہ اپنے دل کا غبار نکالتا ہوں ادھر چل دیا۔ وہاں پر ایک ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم محترمہ کا راج تھا۔ اس نے ہم پر ایک نظر غلط ڈالی۔ اور دراز میں سے آئینہ نکال کر اپنے بال سنوارنے لگ گئی۔ ہم سب اس کے کونٹر کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ راستے میں سیگریڈ نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ مشرقی برلن کی رہنے والی ہے اور سویٹ وظیفے پر انجنیرنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس کو چونکہ روسی زبان خوب آتی تھی، اس لئے ہم نے اسے کہا کہ وہ ہماری نمائندگی میں کونٹر والی محترمہ سے بات کرے۔ ہمیں ماسکو میں رات گذارنے کے لئے ہوٹل دینے کی ذمہ داری ان کی تھی۔

سیگریڈ نے، جس کی عمر انیس بیس برس تھی، لجاتے ہوئے ہمارا کیس پیش کیا۔ مگر کونٹر والی محترمہ نے سر ہلا ہلا کر ذمہ داری سے اپنی برءت کا اظہار کیا۔ سیگریڈ نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مایوسی سے کندھوں کو اچکا دیا، گویا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے کہا کہ ہوائی کمپنیوں کے بین الاقوامی معاہدہ کے مطابق اگر مسافروں کو ان کی منزل مقصود تک پہنچانے میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے، جس کی ذمہ داری ایئر لائن کی ہو، تو اس صورت میں مسافروں کے قیام و طعام کا انتظام ایئر لائن کو کرنا ہوتا ہے۔ سیگریڈ نے بڑے مؤدبانہ انداز میں یہ بات روسی محترمہ سے کہی، جس نے اس کے فقرے کو کاٹ کر پاٹ دار آواز میں کہا کہ ایسا کوئی اصول نہیں ہے اور اگر ہے، تو وہ روس میں نہیں چلتا۔ سیگریڈ مایوس ہو کر ہماری طرف

پلٹی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ۔ اس نے کہا کہ ماسکو میں اس کی خالہ رہتی ہے، جس کے ہاں وہ رات گذار سکتی ہے، مگر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ پھر اس نے خود ہی کہا کہ ہمارے پاس تو بہر صورت فارن کرنسی ہوگی، جو غیر ملکیوں کو ہوٹلوں میں ٹھہرنے کے لئے ادا کرنی پڑتی ہے ۔

ہمارے گروپ کے ایک دو لوگ کچھ ڈھیلے پڑنے لگے ۔ وہ شخص، جس نے سیگریڈ کو پائلٹ کی گود میں بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا، کسی قدر ناپنے ٹاپنے کے بعد اس بات پر آمادہ نظر آتا تھا کہ ٹیکسی منگوالی جائے ۔ ہمارے خرچ پر ہوٹل میں بکنگ کی پیش کش ہمیں کونٹر والی محترمہ کر چکی تھی ۔ مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں تھا ۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے سیگریڈ سے کہا کہ وہ وہاں پر بیٹھ جائے، اب میں اس معاملے کو سلجھاتا ہوں ۔ سیگریڈ نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی ۔ اس نے میری پیش کش کو قبول کیا اور میری جگہ پر جا کر بیٹھ گئی ۔ میں نے کونٹر کے سامنے کھڑے ہو کر محترمہ جیسی اونچی آواز میں پوچھا کہ اس مسخرے پن کا کیا مطلب ہے ۔ یہ اصول ساری دنیا میں چلتا ہے اور تمام ایئر کمپنیاں اس کا پاس کرتی ہیں ۔ اگر تم فوری طور پر ہمارے لئے ہوٹل میں رہائش اور وہاں پر پہنچانے اور اگلے روز وہاں سے ایئرپورٹ پر لانے کا بندوبست نہیں کرتی ہو، تو میں ماسکو ایئرپورٹ کے کمانڈر کے پاس تمہاری رپورٹ کر دوں گا ۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ محترمہ یکدم بدل گئی ۔ اس نے کہا: "محترم آپ غصہ نہ کھائیے، میں اس لڑکی کی بات کو سمجھ نہیں پائی تھی ۔ میں آپ کے لئے فوراً انتظام کر دیتی ہوں" ۔ چنانچہ اس نے فون کرنے شروع کئے اور پندرہ بیس منٹوں کے اندر ہمارے لئے ہوٹل کا انتظام ہو گیا اور ایئرپورٹ کی بس ہمیں ہوٹل میں پہنچانے کے لئے آ گئی ۔ راستے میں سیگریڈ نے، جسے انگریزی نہیں آتی تھی، اس لئے وہ کونٹر والی محترمہ کے ساتھ میری گفتگو کو نہ سمجھ پائی تھی، پوچھا کہ میں نے محترمہ پر کونسا جادو کیا تھا کہ وہ اس قدر جلد ہتھیار ڈال بیٹھی ۔ میں نے کہا کہ محترمہ کا ردعمل سائیکل سواروں کے اصول کا عملی مظاہرہ تھا ۔

"سائیکل سواروں کا اصول؟ یہ کیا بلا ہے؟" سیگریڈ نے اپنی بے حد موہنی

مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

میں نے کہا کہ سائیکل سوار کے جسم کا اوپر والا حصہ جھکا ہوا ہوتا ہے، جب کہ نچلا حصہ ٹانگیں چلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ گویا اوپر والوں کے مقابلے میں انسان جھکا رہے۔ ان کے جا و بیجا احکامات کو تسلیم کرے اور اپنے سے نیچے والوں کی ٹھڈوں کے ساتھ مرمت کرے۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ مسکرا کر چپ ہو گئی۔

ہوٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ سیگریڈ کو میری تجویز سے اتفاق تھا کہ کھانے کے بعد ہمیں تھیٹر یا کسی دوسرے شو میں جانا چاہیئے۔ اس شام بالشوے تھیٹر کا بیلے ڈانس کا پروگرام تھا۔ میرا خیال تھا کہ ٹکٹ سب جا چکے ہوں گے۔ مگر سیگریڈ نے کہا کہ اگر میں قیمت ڈالر میں ادا کرنے کو تیار ہوں، تو آخری منٹ تک سیٹیں مل سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ہوٹل کے تھیٹر ڈیسک نے فوراً ہمارے لئے دو ٹکٹوں کا بندوبست کر دیا اور ہم شو کے شروع ہونے سے پہلے تھیٹر میں پہنچ گئے۔

میرے لئے کسی روسی تھیٹر میں جانے کا وہ پہلا موقعہ تھا، اگرچہ میں ٹیلی وژن پر متعدد بار بالشوے تھیٹر کے پروگراموں کو دیکھ چکا تھا۔ سوویٹ یونین میں ثقافتی پروگراموں کو خاص اہمیت حاصل تھی اور ان پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ ایکٹروں، ڈانسروں، مصوروں اور دوسرے آرٹسٹوں کو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تھیٹر کے تماشائیوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ مزدوروں کی تعداد ان میں دوسروں سے زیادہ لگتی تھی۔

سیگریڈ کا باپ بھی مشرقی جرمنی کے ایک کارخانے میں مزدور تھا۔ اور یہ امر کہ اس کے دونوں بچے، سیگریڈ اور اس کا بھائی، یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، میرے لئے اشتراکی نظام کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ اس زمانے میں مغربی جرمنی میں مزدوروں کے بچے شاذ و نادر ہی یونیورسٹیوں میں پائے جاتے تھے۔ میرے منہ سے ایسے تعریفی کلمات سن کر سیگریڈ بے حد خوش ہوئی، مگر اس نے کہا کہ کیا مجھے پتہ ہے کہ مشرقی جرمنی اس کے لئے کتنی بھاری قیمت ادا کر رہا ہے؟ میں نے

اعتراف کیا کہ مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ معاشی اعتبار سے اس کی کیا قیمت ادا کی جا رہی تھی تاہم مجھے اس کی معاشرتی قیمت کا اندازہ تھا۔ مزدوروں کے بچوں کو تعلیمی میدان میں آگے لانے کی خاطر دانش مند طبقے کے بچوں کا داخلہ یونیورسٹیوں میں بند کر دیا گیا تھا میں نے کہا کہ جو قوم اپنے ذہین ترین طبقے کی صلاحیتیں اس طرح برباد کرتی ہے، اس کو قوموں کی دوڑ میں ایک روز منہ کی کھانی پڑے گی۔

سیگریڈ نے کہا کہ وہ دن کب آئے گا؟ دانش مند تو ایک طرف رہے، خود مزدور اس دن کی راہ تک رہے ہیں۔ وہ لوگ آزادی کی زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں۔ وہ مغربی ممالک کے لوگوں کی طرح سیر و سفر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں کل صبح بازار لے جاؤں گی تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ یہاں کی دوکانیں ساز و سامان سے خالی ہیں۔ تم اس بات کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ ہمیں روزمرہ کی چیزوں کی خریداری کے لئے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ عارضی چیزیں ہیں اور یہ کہ اسے نہیں بھولنا چاہیئے کہ اشتراکی ممالک دنیا کے پرولتاریوں کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور جب تک وہ ہتھیار نہیں ڈالتے، اس وقت تک تیسری دنیا کے لئے امید کا ستارہ روشن ہے۔ سیگریڈ نے کہ کہ تم لوگ سوشلسٹ جنت سے باہر بیٹھ کر یہاں کے خواب دیکھتے ہو تمہیں کیا پتہ ہے کہ یہ جنت کس نوعیت کی ہے۔

مجھے مغربی برلن کی ایک سڑک پر لکھا ہوا ایک سلوگن یاد آگیا، جو چیک پوائنٹ چارلی کی طرف جاتی تھی۔ سمت دکھانے والے تیر کے نیچے لکھا تھا: "سوشلسٹ جنت ←—— ایک سو میٹر"۔ میں برلن کی دیوار کے بنائے جانے کے تھوڑے دنوں کے بعد چیک پوائنٹ چارلی سے گذر کر مشرقی برلن گیا تھا۔ ہمارے مغربی برلن کے گائیڈ نے کہا تھا کہ اب ہم سوشلسٹ جنت میں داخل ہو رہے ہیں، جس کے باسیوں کے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ جب مشرقی برلن کا گائیڈ ہماری بس میں سوار ہوا، تو اس نے کہا کہ ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ قید خانہ دیوار کے اس طرف یا اس طرف ہے۔ سیگریڈ نے کہا کہ یہ بات تو چڑیا گھر جیسی ہوئی، جس کے بارہ میں کوئی شخص وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا انسان

بندروں کا تماشا کرتے ہیں یا بندر انسانوں کا۔اس نے کہا کہ اگر میں اس کے مشرقی برلن واپس آکر آباد ہونے کے بعد کبھی آیا، تو وہ مجھے اس پنجرے کی اندر سے سیر کرائے گی تاکہ میں خود جنت یا قید خانے کے بارہ میں فیصلہ کر سکوں۔

ہماری بحث ہوٹل میں واپس لوٹنے کے بعد پو پھٹنے تک چلتی رہی۔اسے مغربی دنیا کے بارہ میں بہت کچھ جاننے کا شوق تھا اور مجھے اشتراکی ممالک کے اندرونی تضادات کی قابل فہم تشریح و توضیح درکار تھی۔جوں جوں رات بھیگتی گئی ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔میرے اندر چھپا ہوا اشتراکی دھیرے دھیرے اپنا ایمان کھوتا گیا اور سیگریڈ پر یہ بات کھلتی گئی کہ مغربی دنیا کی زندگی دور کے سہانے ڈھول کے سوا کچھ نہ تھی۔شخصی آزادی کا نعرہ بے حد دلفریب تھا، مگر وہ شخص اس آزادی سے کیا حاصل کر سکتا ہے، جسے کھانے کو کچھ نہ ملے۔اور ایسے لوگوں کی مغرب میں کمی نہیں ہے۔

دو تین گھنٹوں کے مختصر آرام کے بعد ہم اٹھ گئے اور ناشتہ کر کے شہر کے مرکز کی طرف روانہ ہو گئے۔سب سے پہلے ہم نے ارباط اسٹریٹ کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا۔اتنی صبح مصوروں نے ابھی اپنے اڈے نہیں لگائے تھے، جہاں پر سیگریڈ کے بیان کے مطابق آرٹ کے عمدہ نمونے کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔ دوسری دوکانیں کھل گئی تھیں، مگر ان میں میرے کام کی کوئی چیز مجھے نظر نہ آئی۔ سیگریڈ کو اس بازار کے ایک ریستوران میں جانے کا شوق تھا، مگر وہاں پر گاہکوں کی اتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں سے پہلے باری آنے کی امید نہ کی جا سکتی تھی۔اس لئے ہم نے ریڈ اسکوئیر کا رخ کیا، جہاں پر کریملین پایا جاتا ہے۔لینن اور اسٹالن کے مزاروں کے سامنے لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔سیگریڈ نے کہا کہ وہ لوگ اپنے نئے خداؤں کی لاشوں کو دیکھ کر ایمان تازہ کرنے کے لئے جمع ہیں۔ اس کی نظروں میں کمیونزم ایک مذہب تھا اور کریملین اس کا مکہ تھا، جس کی سمت دنیا بھر کے کمیونسٹ امید بھری نظروں سے تکتے تھے۔

مجھے سیگریڈ پر حیرت ہو رہی تھی، کیونکہ وہ خود اس نظام کی پروردہ تھی۔اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی اس نظام سے منسلک تھی۔اس کا باپ نہ صرف

کیمونسٹ پارٹی کا ممبر تھا، بلکہ اپنے کارخانے میں پارٹی کا معتمد تھا۔ سیگریڈ کا وظیفے پر سویٹ یونین میں تعلیم حاصل کرنا ایک انعام سے کم نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ وظیفہ اس کو شاید اپنی لیاقت کے بل پر ہی ملا ہوگا، مگر کتنے ہی دوسرے لائق و فائق طالب علموں کو محض اس وجہ سے مقابلے میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تھا کہ ان کے باپ ڈاکٹر، انجنیئر یا پروفیسر تھے اور ان کا تعلق صاحب جائیداد خاندانوں سے تھا۔ میرا واسطہ مغربی جرمنی میں آئے دن ایسے لوگوں سے پڑتا تھا، جنہیں کیمونزم ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ ایک روز میری ملاقات سیگریڈ جیسی لڑکی سے ہوگی، جو کیمونزم کی پروردہ ہو کر اس کو اس طرح رد کرے گی۔

جب میں نے اسے یہ بات کہی، تو وہ ذرہ بھر نہ جھینپی۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا، تو میں بھی شاید اسی نتیجے پر پہنچتا۔ کیونکہ کیمونزم کے دکھانے کے دانت اور ہیں اور کھانے کے دوسرے۔ جس قسم کی دھاندلیاں مشرقی جرمنی میں روزمرہ پارٹی اور حکومت کے کارندے کرتے ہیں، ان کا پتہ اگر عوام کو چل جائے، تو ملک میں انقلاب آجائے۔ اس کے باپ نے مشرقی برلن کے مضافات میں ایک ڈاچا بنایا تھا، جس کا سارا عمارتی سامان "آرگنائزڈ" گویا چوری شدہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے ملک میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو دھوتا ہے۔ لیکن بات نکل جائے، تو ہر شخص یہ باور کراتا ہے کہ اسے کسی چیز کا علم نہ تھا۔ جب چھوٹے کارندوں کا یہ حال ہے، تو اوپر والے کیا کچھ کرتے ہوں گے۔

ہوائی جہاز میں ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ مگر وہاں پر دوسرے مسافروں کی موجودگی میں باتیں اس قدر کھل کے نہ ہو سکتی تھیں۔ سیگریڈ نے مجھے خاص طور پر توجہ دلائی تھی کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ مشرقی جرمنی میں ہر دوسرا یا تیسرا شخص خفیہ پولیس کے لئے مخبری کرتا ہے۔ اس لئے ہماری گفتگو کا محور نجی معاملات اور بے ضرر قسم کے چٹکلے اور لطیفے بن گئے۔ سیگریڈ اپنی یونیورسٹی کی باتیں سناتی رہی، جہاں پر درجن بھر روسی اس کو شادی کی پیش کش کر چکے تھے، کیونکہ اس طرح انہیں مشرقی جرمنی میں آنے کی اجازت مل

سکتی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا کہ کیا اس کے لئے میرے سوٹ کیس میں جگہ بن سکتی ہے ؟

ہمیں بھاری دل کے ساتھ مشرقی جرمنی کے ہوائی اڈے شوینے فیلڈ پر ایک دوسرے کو الوداع کہنا پڑا۔ سیگریڈ نے خاص طور پر فرمائش کی کہ جب بھی میرا غیر ملکوں میں سفر پر جانا ہو، تو اسے ویو کارڈ بھیجنا نہ بھولوں۔ اس نے خود بھی خط لکھنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اڈیسہ واپس پہنچ کر اس نے ایک لمبا خط لکھا، جس کے بعد ہماری آپس کی باقاعدہ خط و کتابت کا آغاز ہو گیا، جو وقفوں کے ساتھ کئی برسوں تک جاری رہی۔

سیگریڈ اپنے خطوں میں بہت محتاط تھی، کیونکہ ڈاک سنسر ہوتی تھی۔ کیا مجال ہے جو تنقید کا ایک فقرہ بھی ان میں جگہ پاتا ہو۔ اس کی بجائے وہ پولی ٹیکنیک کی باتیں لکھتی تھی، جہاں پر دنیا بھر کے ملکوں کے طالب علم پڑھتے تھے۔ پھر اس کے خطوں میں سرگے کا ذکر تواتر کے ساتھ ہونے لگا، جو اس سے ایک سال آگے تھا۔ وہ گروزینین قومیت رکھنے والا روسی تھا۔ اس کا گاؤں اڈیسہ سے زیادہ دور نہ تھا۔ چھٹیوں میں وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کی ماں سیگریڈ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس خبر سے میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ ان کی دوستی ایک سنجیدہ موڑ مڑنے والی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اگلے خط میں سیگریڈ نے سرگے کے ساتھ اپنی منگنی کی خبر سنائی۔ اس سے اگلے برس سیگریڈ کے فائینل امتحان کے خاتمے پر ان کی شادی ہو گئی۔ اس تقریب کی تصویریں اس نے مجھے بھیجیں۔ انہی دنوں میں میاں بیوی مشرقی جرمنی منتقل ہو گئے، سیگریڈ نے مجھے اپنا نیا پتہ بھیجا اور برلن آنے کی دعوت دی۔

میں سیگریڈ کا خط ملنے سے اگلے روز قاہرہ جا رہا تھا، جہاں پر مجھے یونیسکو کے ایک سیمینار میں شرکت کرنی تھی۔ وہاں پر تیس ملکوں کے نمائندے جمع تھے۔ اشتراکی ممالک میں سے صرف مشرقی جرمنی سے تین افراد پر مشتمل ایک وفد آیا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے صرف گونتھر سیمینار کے موضوع کا اختصاصی علم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ میرے تعلقات ایک حد تک دوستانہ بن گئے۔ مجھے یوں بھی اس کی کمک کی خاطر اس کا مترجم بننا پڑتا تھا، کیونکہ اس کو صرف جرمن زبان آتی

تھی، جب کہ سیمینار کی زبانیں عربی، انگریزی اور فرانسیسی تھیں۔ دوسرے دونوں افراد مجھ سے دور دور رہتے تھے۔ اور عام طور سے انہیں سیمینار کی کاروائی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک روز میں نے دوپہر کے وقفے کے دوران گوتمر سے اس کے ساتھیوں کی موجودگی میں سیگریڈ کا ذکر کیا اور بتایا کہ ہماری ملاقات کہاں پر اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ اب جب کہ وہ اپنے روسی خاوند سمیت مشرقی برلن میں آکر بس گئی تھی، میں اسے قاہرہ سے کوئی چھوٹا موٹا تحفہ بھیجنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس تحفے کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو، تو میں شام کو خان خلیلی میں جاکر کوئی چیز خرید لوں گا۔ میں نے دیکھا کہ تینوں کے چہرے پتھرا گئے۔ تحفے کے بارہ میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پھر باتوں کا رخ دوسرے معاملات کی طرف مڑ گیا۔ بعد میں گوتمر نے علیحدگی میں مجھے بتایا کہ اس کے ساتھیوں میں سے ایک کیمونسٹ پارٹی کا ممبر تھا اور اس کی نگرانی کے لئے بھیجا گیا تھا، جب کہ دوسرے کا تعلق خفیہ پولیس کے ساتھ تھا اور وہ دونوں کی مخبری کرتا تھا۔ اس نے تحفہ لے جانے سے معذرت چاہی اور کہا کہ اگر بات اس کے ساتھیوں کے سامنے نہ ہوئی ہوتی، تو اسے تحفہ لے جانے پر یقیناً کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

ڈیڑھ دو سالوں کے بعد میرا مغربی برلن میں ایک تقریر کے سلسلہ میں جانا ہوا۔ میں نے مقررہ تاریخ سے دو ہفتے قبل سیگریڈ کو خط میں اطلاع کر دی تھی۔ میری روانگی والے دن تک اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے پروگرام کے مطابق مشرقی برلن چلا گیا۔ مکان تلاش کرنے میں مجھے کچھ ایسی دقت نہ ہوئی۔ میرے گھنٹی بجانے پر سرگے نے دروازہ کھولا۔ میرا خط انہیں نہیں ملا تھا۔ شاید وہ سنسر شپ کی نذر ہو گیا تھا۔ سرگے مجھے خوب جانتا تھا۔ سیگریڈ اسے میرے بھیجے ہوئے ویو کارڈ دکھایا کرتی تھی اور اسے کئی بار ماسکو ایئرپورٹ والا واقعہ سنا چکی تھی۔ شومئ قسمت سے میں ایسے وقت میں آیا تھا جب سیگریڈ گھر پر نہ تھی۔ دراصل وہ ایک کلینک میں داخل تھی، جہاں پر اس نے ایک روز قبل ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ سرگے اپنے فلیٹ میں وال پیپر لگا رہا تھا اور سیگریڈ کے گھر لوٹنے سے قبل فلیٹ کا حلیہ بدل دینا چاہتا تھا۔ مگر مارکیٹ میں کئی ایک چیزیں بالکل مفقود تھیں۔

وہ ہفتوں سے دوکانوں کا چکر لگا رہا تھا اور اپنے دوستوں سے بھی مدد کا خواہستگار ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے نوٹ کیا ہوگا کہ مشرقی جرمنی میں ہر شخص کے ہاتھ میں تھیلا پکڑا ہوا ہوتا ہے۔ جہاں کہیں کوئی چیز نظر آجائے، لوگ اسے خرید لیتے ہیں، خواہ اس کی فوری طور پر ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بعد میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ کمرے کی الماری کے لئے انہیں دو سالوں تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ موٹر کار کے لئے انتظار کی مدت اس زمانے میں اٹھارہ برس مقرر تھی۔

فلیٹ ڈیڑھ کمرے کا تھا۔ باورچی خانہ اس کے علاوہ تھا، جس میں سرگے شاور لگانا چاہتا تھا، کیونکہ باتھ روم سرے سے موجود نہ تھا اور مشترکہ ٹائیلٹ مکان کے پچھواڑے میں بنے ہوئے تھے۔ شاید سرگے نے میرے چہرے سے پڑھ لیا تھا کہ مجھے ان کا فلیٹ کچھ ایسا پسند نہ آیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس فلیٹ کو حاصل کر کے بے حد خوش ہوئے تھے۔ اور یہ کہ فلیٹ انہیں صرف اس وجہ سے مل سکا تھا کہ سیگریڈ حمل سے تھی۔ اس سے قبل انہیں دو برسوں تک ایک کمرے میں رہنا پڑا تھا، جس میں انہیں اپنا کھانا بھی پکانا پڑتا تھا۔ سرگے نے کہا کہ روس میں اسے اپنی ماں اور پانچ بہن بھائیوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کا تجربہ تھا۔ اس لئے ڈیڑھ کمرے کے فلیٹ کا ملنا خوش بختی سے کم نہ تھا۔

سرگے کو ایک فیکٹری میں کام ملا ہوا تھا۔ اس کے سیکشن میں اس سمیت پانچ انجنیئر متعین تھے۔ اگرچہ کام وہاں پر صرف تین آدمیوں کے لئے پایا جاتا تھا، جسے چار کولیگ آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ پانچواں انجنیئر دو سالوں سے وہاں پر تھا، مگر کام اسے ایک روز بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ ہر روز دوسروں کی طرح بر وقت فیکٹری میں آتا تھا۔ ناشتہ ان کے ساتھ مل کر کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی کافی بھی اس کی دوسروں کی طرح لگی ہوئی تھی۔ وہ سارا دن بیٹھا ہوا اخبار پڑھتا رہتا تھا یا دوسرے کولیگوں کے لئے خریداری کرنے کے لئے دوکانوں کا چکر لگاتا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ شخص دراصل بے روزگار تھا۔ سرگے نے کہا کہ اشتراکی نظام کے ذخیرہ الفاظ میں بے روزگاری کا لفظ نہیں پایا جاتا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آزادی رائے یا شخصی خود مختاری کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس پر سرگے بہت ہنسا۔ اس نے کہا کہ ضرور

پائے جاتے ہیں، مگر ان کی تشریح وہ نہیں ہے، جس کے تم مغرب میں عادی ہو۔ اس نے کہا کہ وہ ایک روز اس محکمہ میں گیا، جہاں پر ملک سے عارضی طور پر باہر جانے کے لئے ویزا جاری ہوتا ہے۔ اس نے ایک روز کے لئے مغربی برلن جانے کی اجازت چاہی۔ وہ صبح جانا چاہتا تھا اور شام کو لوٹنے کا ارادہ رکھتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے ہم لوگ مغربی برلن سے مشرقی برلن جایا کرتے تھے۔ متعلقہ کلرک نے کہا کہ اصولی طور پر اس کی درخواست قابل قبول ہے۔ مگر اس کے لئے ایک ویٹنگ پیریڈ مقرر ہے۔ اس نے سرگے سے اس کی عمر پوچھی۔ سرگے نے کہا: تیس برس۔ اس پر کلرک نے کہا کہ اس کے لئے ویٹنگ پیریڈ پینتیس سال مقرر ہے۔ پینسٹھ سال کی عمر میں جب اس کی پنشن ہو جائے گی، تو اسے مغربی برلن یا مغربی جرمنی جانے کی کھلی آزادی حاصل ہو گی۔ وہ نہ صرف ایک دن کے لئے یا ایک مہینہ کے لئے ادھر جا سکے گا، بلکہ ہمیشہ کے لئے نقل مکانی کر سکے گا۔

آئندہ کئی برسوں تک مجھے برلن جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ البتہ خط و کتابت کے ذریعہ سیگریڈ کے ساتھ رابطہ قائم رہا۔ اس دوران میں اس کی سرگے سے ناچاقی ہو گئی۔ طلاق ملنے پر وہ بیٹی سمیت دوسرے فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ اس نے فیکٹری میں کام چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ روسی زبان سے ٹیکنیکی کتابوں کے تراجم کرنے لگی تھی۔ یہ کام وہ گھر پر کر سکتی تھی۔ گاہے بگاہے اسے روسی وفود کے ساتھ مترجم کی حیثیت سے جانا پڑتا تھا۔ باقی دنوں میں اس کا وقت اپنی بیٹی لورین کے ساتھ گذرتا تھا، جو بڑی پیاری بچی تھی اور بہت سمجھ کی باتیں کرنے لگی تھی۔ لورین کی تصویریں وہ مجھے باقاعدگی سے بھیجتی رہی، بالخصوص برتھ ڈے کی تصویریں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ماں بیٹی میں قطعاً کوئی مشابہت نہ تھی۔ شاید لورین اپنے روسی باپ کے خاندان پر گئی تھی۔

سیگریڈ مجھے اپنے ہر خط میں مشرقی برلن آنے کی دعوت دیتی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کو ملے ہوئے دس برس ہو چلے تھے۔ اس عرصے میں دنیا میں بے شمار بدلیاں رونما ہوئی تھیں۔ خود ہم بدل گئے تھے۔ کیا سیگریڈ کے خیالات میں بھی کوئی تبدیلی آئی تھی؟ اس بات کو انسان خطوں کے ذریعہ نہ جان سکتا تھا، جو دو بار

سنسر ہو کر مکتوب الیہ تک پہنچتے تھے۔ پچیس تیس دن خط مشرقی جرمنی کے متعلقہ محکمے کے پاس پڑے رہتے تھے اور اتنے ہی دن مغربی جرمنی کا سنسر شپ ڈپارٹمنٹ لیتا تھا۔ اس وجہ سے خط کا جواب تین چار ماہ سے قبل نہ ملتا تھا۔ ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ سیگریڈ کے گھر پر فون نہ تھا۔ یوں بھی فون پر کی جانے والی گفتگو کو خفیہ پولیس کا محکمہ ٹیپ کر لیتا تھا۔ اس وجہ سے کسی واقف کار کے گھر سے مغربی جرمنی فون کرنا اس کو مشکلات میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

پھر میرا برلن یونیورسٹی کے ایک سیمینار کے سلسلہ میں ادھر جانا ہوا۔ میں شام کے وقت مشرقی برلن گیا۔ چیک پوائنٹ چارلی پہ بہت سا وقت انتظار اور پاسپورٹ کی چیکنگ پہ لگ گیا۔ ہر شخص کو پچیس ویسٹ جرمن مارک کے بدلے میں پچیس ایسٹ جرمن مارک دیئے گئے، جب کہ مارکیٹ میں ان کی شرح تبادلہ ایک ویسٹ جرمن مارک کے مقابلے میں چھ ایسٹ جرمن مارک تھی۔ دوسری طرف مشرقی جرمنی میں ہر چیز سستی تھی، بلکہ مغربی جرمنی کی مہنگائی کے حساب سے کوڑیوں کے مول بکتی تھی۔ مجھے چونکہ سیگریڈ کے گھر آنے جانے کے لئے صرف کرایہ درکار تھا، جو چند مارک سے زیادہ نہ تھا، اس لئے باقی رقم سے پھولوں کا گلدستہ خرید لیا گیا۔

سیگریڈ نئی آبادی میں رہتی تھی، جہاں پر کنکریٹ کی بنی ہوئی کئی منزلہ عمارتوں کا جنگل اگ آیا تھا۔ سب عمارتیں ایک جیسی تھیں۔ پورے علاقے پر مایوسی اور شکست خوردنی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ سٹی پلانرز کو شاید کسی نے نہیں بتایا تھا کہ جہاں پر انسانوں کو بسایا جائے، وہاں پر باغ باغیچے بھی بنائے جانے چاہئیں۔ سڑکوں کے کنارے پھولوں کی کیاریاں ماحول کو خوش آئند بناتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ایسے خیالات مجھ جیسے زائر کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں، جو چند گھنٹے وہاں پر گذار کر چلا جائے گا، تو ان لوگوں کے دلوں پر کیا گذرتی ہو گی، جو وہاں پر ساری زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔

بالآخر میں سیگریڈ کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع نہ دی تھی، اس لئے مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ گھر پر ہو گی یا نہیں۔ اندر لورین کے

دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ریڈیو پر گانا لگا ہوا تھا۔ میرے گھنٹی بجانے پر سیگریڈ کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے وہ میرے سامنے کھڑی تھی، بلکہ میرے بازوؤں میں تھی۔ میں نے ماسکو میں جس نوخیز کلی کو دیکھا تھا، وہ کھل کر پھول بن چکی تھی۔

سیگریڈ کو ایک کمرے کا فلیٹ ملا ہوا تھا اور وہ بھی بہت دوڑ دھوپ کے بعد۔ اس کو اشارۃً بتایا گیا تھا کہ اگر وہ کمیونسٹ پارٹی کی ممبر بن جائے، تو اس سے بہتر فلیٹ کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اور اگر وہ خفیہ پولیس کے لئے مخبری کرنے کو تیار ہو، تو اس کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ سیگریڈ اس کام کے لئے تیار نہ تھی، اس وجہ سے اسے اپنی زندگی اس ایک کمرے میں گذارنی ہو گی۔ اس نے کہا کہ لورین اس کے لئے امید کی واحد کرن اور مسرت کا منبع ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔

جب میں نے پوچھا کہ کیا وہ بدستور اشتراکی نظام کے خلاف ہے، تو اس نے سر کو اثبات میں ہلایا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کے اندر اس نظام سے لڑنے بھڑنے کی امنگ باقی نہ تھی۔ نوجوانی کے دنوں کے ولولے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اس نے کہا کہ اس قید خانے سے بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھ سے بیر رکھنا بیوقوفی کے مترادف ہے۔ شاید یہ قسمت کا کھیل تھا کہ اس کے خاندان کو چار نسلوں سے شکست اور بربادی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ پردادا پہلی جنگ عظیم میں اور دادا دوسری عالمگیر جنگ مارا گیا تھا، جب کہ وہ سرے سے نازی پارٹی کا حامی نہ تھا۔ باپ کو کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی، کیونکہ اس کی قسمت میں مشرقی جرمنی میں رہنا لکھا تھا۔ سیگریڈ اور اس کے بھائی پر باہر کی دنیا کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ اب وہ مجھ سے بھی رابطہ نہ رکھ سکے گی۔ کیونکہ پارٹی میں شمولیت کی دعوت کے ساتھ یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ مغربی جرمنی میں کسی کے ساتھ رابطہ نہیں رکھے گی۔

مجھے نصف شب سے پہلے مشرقی جرمنی کی سرحد کو پار کرنا تھا۔ اس لئے بہت سی باتیں ان کہی رہ گئیں۔ سیگریڈ مجھے ٹیکسی اسٹینڈ پر چھوڑنے کے لئے آئی۔ اس نے کہا کہ میرے خطوط پا کر اسے ہمیشہ تسلی ملتی تھی کہ آزاد دنیا میں کوئی تو اس کو عزیز

رکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اس کی یاد کو تازہ رکھوں گا اور یہ فرمائش کی کہ جب کبھی اسے کسی دوسرے ملک میں جانے کا موقعہ ملے، تو وہ مجھے ویو کارڈ بھیجے، تاکہ کم از کم مجھے اس کی خبر ملتی رہا کرے۔ اس کے لئے وہ تیار تھی، مگر میرے خطوط کے بند ہو جانے کے خیال سے سخت رنجیدہ تھی۔ ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے ہم آخری بار بغل گیر ہوئے اور میں نے اسے ایک لمبا اور گہرا بوسہ دیا، جس کے بارے میں ہمیں پتہ تھا کہ وہ ہمارا آخری بوسہ تھا۔

آئندہ برسوں میں مجھے ایک ویو کارڈ ہنگری سے اور دوسرا چیکو سلوواکیہ سے ملا۔ سیگریڈ کو ایک بڑا فلیٹ مل گیا تھا اور اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے لکھا کہ اس کی زندگی میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اس نے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا تھا، جن کی مدد سے اس نے برلن کے مضافات میں ایک ڈاچا "آرگنائز" کر لیا تھا۔

پھر مشرقی جرمنی میں خاموش انقلاب برپا ہوا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بوڈاپسٹ میں مغربی جرمنی کے سفارت خانے میں گھس گئے اور انہوں نے اپنے ملک کو خیر باد کہہ دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ ڈرامہ پراگ میں دہرایا گیا۔ اور ہزاروں انسانوں کو مغربی جرمنی میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ مشرقی جرمنی کے شہروں میں جلوس نکالے جانے لگے اور جرمن قوم کے اتحاد کا مطالبہ سرعام کیا گیا۔ مشرقی جرمنی کے باسی لاکھوں کی تعداد میں مغربی جرمنی منتقل ہو گئے۔ ہزاروں مرد اپنے بچوں اور بیویوں کو بتائے بغیر چلے گئے۔ اور سینکڑوں بچوں کے ماں باپ انہیں ان کی قسمت پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

جب حالات کسی قدر نارمل ہوئے اور ڈاک پر سے سنسر شپ اٹھا دی گئی، بلکہ خفیہ پولیس کے محکمے کو توڑ دیا گیا، تو میں نے سیگریڈ کے نام خط لکھا۔ چونکہ خط لوٹ کر نہیں آیا، اس لئے میں جان گیا کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتی یا شاید نہیں دے سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اس دوران میں پھر شادی کر لی ہو اور اس کے خاوند کو یہ امر پسند نہ ہو کہ وہ غیر مردوں کے ساتھ خط و کتابت کرے۔ اگرچہ میں اتنا بھی غیر نہیں ہوں کہ مجھے چند سطروں کا خط نہ لکھا جا سکتا ہو۔

مہینوں کے بعد اچانک اس کے خاوند کا خط آگیا۔ اس نے اس امر کی معذرت چاہی کہ اس نے سیگریڈ کے نام میرے خط کو کھول لیا تھا۔ دراصل سیگریڈ اس کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر مغربی جرمنی چلی گئی تھی۔ اس وقت سے اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ چونکہ میں مغربی جرمنی میں اس کا واحد دوست تھا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ سیگریڈ نے اس دوران میں مجھ سے رابطہ کیا ہو۔ اگر میں سیگریڈ کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کر سکوں، تو وہ اس احسان کو عمر بھر نہیں بھولے گا۔ وہ اس بات کو بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا کہ سیگریڈ نے کیوں یہ قدم اٹھایا تھا۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ سرحد دوبارہ بند کر دی جائے گی۔ اس لئے ان نے موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا اور اکیلی چلی گئی تھی۔

اس کے خاوند کے ساتھ مل کر میں نے سیگریڈ کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس عرصے میں مشرقی اور مغربی جرمنی متحد ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اشتراکی حکومت کے قائم کردہ نظام کا پول کھلنے لگا۔ ہر روز نئی تفصیلات سامنے آنے لگیں۔ پہلے پہل ٹیلی ویژن کی ٹاک شوز یا دوسرے پروگراموں میں وہ لوگ پیش کئے گئے، جو ظلم و جور کا شکار بنے تھے، جن کی املاک زبردستی حکومت نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں یا جنہیں قید و بند کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے، جنہیں بالکل علم نہ تھا کہ ان سے کیا قصور سرزد ہوا تھا۔ انہوں نے کبھی اعلانیہ طور پر اشتراکی نظام کی مخالفت نہ کی تھی، اگرچہ اپنے دل میں وہ اس نظام کو برا جانتے تھے۔ مگر سوائے قریبی دوستوں اور خاندان کے افراد کے اور کسی کے سامنے انہوں نے اس بات کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس عرصے میں خفیہ پولیس کے نظام مخبری کے راز فاش ہونے لگے۔ اور پہلی بار لوگوں کو پتہ چلا کہ کس طرح قدم قدم پر ان کی نگرانی کی جاتی تھی۔ مشتبہ افراد کی فائلیں تیار ہوتی تھیں، جن میں ان کے بارے میں ایک ایک بات نوٹ کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے الیکٹرونیکس کا استعمال ہوتا تھا، جن کا ملک میں ایک جال بچھا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ کامیاب طریق ذاتی نگرانی کا تھا، جس کے لئے مشتبہ افراد کے قریبی حلقہ میں سے لوگ متعین کئے جاتے تھے، جو "غیر رسمی ایجنٹ" کہلاتے تھے۔

پھر ایک روز ٹیلی ویژن نے ایک "غیر رسمی ایجنٹ" کو پیش کیا۔ اس کی شناخت کو چھپانے کی خاطر اس کی تصویر پشت کی جانب سے دکھائی گئی۔ مگر میں اس کی آواز کو سنتے ہی پہچان گیا کہ وہ سیگریڈ تھی۔ اس نے بیان کیا کہ کس طرح اس کو لالچ دے کر مخبری پر آمادہ کیا گیا تھا۔ خفیہ پولیس نے ہی اسے ایک چرچ گروپ میں داخل ہونے کو کہا تھا، جس کے ممبر اینٹی اسٹیٹ کاروائیوں کے لئے مشہور تھے، وہاں پر اس کی ملاقات اپنے بعد میں ہونے والے خاوند کے ساتھ ہوئی۔ گروپ کی میٹنگوں کی ساری کاروائی اور اپنے خاوند کے کاموں اور منصوبوں کے بارے میں مکمل رپورٹ وہ ہر ہفتے خفیہ پولیس کے کارندوں کے حوالے کرتی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کبھی نہ آیا تھا کہ اشتراکی نظام حکومت ایک روز تیلیوں سے بنائے ہوئے محل کی طرح زمین بوس ہو جائے گا۔ اب وہ اپنے خاوند کو اور دوسرے دوستوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھی، جن کی مخبری وہ برسوں تک کرتی رہی تھی۔

اب آ کے مجھ پر یہ بات کھلی کہ سیگریڈ نے مغربی جرمنی پہنچنے کے بعد مجھ سے کیوں رابطہ نہ کیا تھا۔ میں نے گذشتہ دنوں میں حکومت کے اس محکمہ کو، جس کے سپرد خفیہ پولیس کے آرکائیوز کا انتظام و انصرام کیا گیا ہے، اپنی خفیہ فائل نکلوانے کے لئے درخواست بھیجی ہے۔

(کر فیلڈ (جرمنی) ۔ ۲۲ مئی ۱۹۹۳ء)

پچیسویں سالگرہ

جہاں پر بس نے مجھے اتارا تھا، وہاں پر دور و نزدیک کوئی شخص نہ تھا، جس سے اسٹڈلے کالج کا راستہ پوچھا جا سکتا۔ سورج ڈھل چکا تھا، مگر شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ بس اسٹینڈ کے بالمقابل ایک پب تھا، جو اسوقت بند تھا۔ دو ایک مکانات تھے، مگر سڑک پر کوئی آدم زاد نہ تھا۔ کچھ عجب نہ تھا کہ مجھے انگلستان کے نقشے پر اس جگہ کو ڈھونڈنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر اتفاق سے مجھے پتہ نہ ہوتا کہ وہ جگہ شکسپیر کی جنم بھومی اسٹریٹفورڈ اپون ایون کے قرب و جوار میں واقع ہے، تو میرا وہاں پر پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ چنانچہ جب میں نے بولٹن کی ریلوے انکوائری سے اسٹڈلے کے بارہ میں پوچھا، تو کلرک نے مجھے اسطرح گھور کر دیکھا، جیسے میں انگلستان کے کسی مقام پر جانے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا، بلکہ دنیا کے کسی دور دراز جزیرے کا اتا پتا جاننا چاہتا تھا۔ اسٹریٹفورڈ اپون ایون کا ذکر آتے ہی اسکی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے بتایا کہ وہاں پر پہنچنے کا سہل طریق کوچ سے سفر کرنا تھا، جو مجھے راستے میں دو جگہوں پر بدلنی پڑے گی۔ جب میں بالآخر اسٹڈلے والی بس میں سوار ہوا، تو کنڈکٹر نہ صرف میرا ہموطن بلکہ گرائیں نکل آیا۔ بس میں سوار ہونے سے قبل میں نے تصدیق کرانا چاہی تھی کہ کیا اسکی بس فی الوقعہ اسٹڈلے سے گذرے گی۔ اس نے جان لیا کہ میں اس ملک میں اجنبی تھا، اسلئے اس نے مجھ سے میرا اتا پتا پوچھا۔ اس کی اردو کا مخصوص پٹھوہاری لہجہ سن کر میں جان گیا کہ وہ میری طرح راولپنڈی کے گرد و نواح کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پہلو والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا، تاکہ راستے میں گپ شپ ہو سکے۔ دوسری سواریوں کو ٹکٹ دینے کے

بعد وہ میری طرف لوٹا اور اس نے میرے لئے ٹکٹ کاٹا، مگر مجھ سے کرائے کے پیسے لینے کیلئے تیار نہ ہوا۔ میں نے بہتیرا زور لگایا، مگر اسکے خلوص کے سامنے میری ایک پیش نہ گئی۔

مجھے بس اسٹینڈ پر کھڑے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کالج کی بس آگئی۔ پتہ چلا کہ وہ سارا دن ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چلتی تھی۔ کالج وہاں سے ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس روز صبح سے مہمان سیمنار میں شمولیت کے لئے آرہے تھے۔ تیس چالیس افراد تو ضرور پہنچ چکے ہوں گے۔ کالج دراصل گرما کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھا اور ساری لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو گئی ہوئی تھیں۔ کیا مجھے پتہ نہیں ہے کہ اسٹڈلے گرلز کالج ہے؟ ڈرائیور، جو میری معلومات میں اضافہ کر رہا تھا، میری بے خبری پر حیران ہو رہا تھا۔ پھر اسے شرارت سوجھی اور اس نے آنکھوں کو مچکا کر کہا کہ جو بستر ہمیں سونے کے لئے دیئے جائیں گے، وہ لڑکیوں کے بستر ہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا: کنواری لڑکیوں کے بستر۔ ابھی وہ اسٹڈلے کالج کا صرف اسی قدر تعارف کرا پایا تھا کہ کالج کی بلڈنگ آگئی، جو وکٹورین اسٹائل کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ ڈرائیور مجھے استقبالیہ کی ڈیسک پر چھوڑ آیا، جہاں پر میرا استقبال ایک خاصی دلفریب جرمن لڑکی نے کیا، جو کاغذی کاروائی کے بعد مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے کے لئے ساتھ گئی۔ راستے میں وہ مجھے کالج کے قواعد و ضوابط بتاتی گئی۔ ڈائننگ ہال دکھایا اور کھانے کے اوقات سے آگاہ کیا۔ پانچ بجے کی چائے کا وقت ہو رہا تھا، جس میں شامل ہونے کے لئے جلدی کرنے کی وہ مجھے تاکید کرتی گئی۔

چائے کی گھنٹی بجنے پر میں دوسروں کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ہال میں پہنچا، جو چائے اور تازہ کیک کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ٹی بیگ سے چائے بنانے کی بے ہودہ رسم نہ پڑی تھی۔ اتفاق سے مجھے استقبالیہ والی مارلس کی میز پر اس کے پہلو میں جگہ ملی۔ کالج کی سپرنٹنڈنٹ مسز ونٹر نے ہمیں سب سے پہلے کالج اور اس کی بلڈنگ سے متعارف کرایا، جو پہلے وقتوں میں ایک امیر کبیر خاندان کا رہائشی مکان رہ چکی تھی۔ وہ لوگ مر کھپ تو نہیں گئے تھے، مگر انہوں نے وہاں سے نقل مکانی کر لی تھی۔ البتہ ان کے جد امجد کی روح وہیں پہ رہ گئی تھی، جو راتوں کو

کوریڈوروں اور ہالوں میں بھٹکتی ہوئی پائی گئی تھی۔ جن لوگوں کا اس سے آمنا سامنا ہوا تھا، ان کا کہنا تھا کہ وہ بالکل بے ضرر تھی۔ بلکہ اس نے ان کی موجودگی کا ذرہ بھر نوٹس نہ لیا تھا۔ اگر ہم میں سے کسی کو وہ راتوں کو نظر آجائے، تو اسے چھیڑے بغیر خاموشی سے اس کے پاس سے گذر جائیں۔

سب جانتے ہیں کہ پرانی عمارتوں کے بارہ میں ایسی باتیں انہیں پر اسرار بنانے کی خاطر گھڑی جاتی ہیں۔ ہماری میز پر اور شاید دوسری میزوں پر بھی یہی امر مرکز گفتگو بن گیا۔ ہم نے مارلس سے جاننا چاہا کہ اس کا آمنا سامنا بوڑھے لارڈ کی روح سے کتنی بار ہو چکا ہے۔ اس نے اس سوال کے مزاحیہ پہلو کو بھانپتے ہوئے جواب دیا کہ اتنے سارے جوان لوگوں کے ہوتے ہوئے بوڑھی روحوں میں کیا دھرا ہے۔ کسی نے کہا کہ نوجوانوں کے اندر بھی تو بوڑھی روحیں ہی بستی ہیں۔ دوسرے نے لقمہ دیا کہ اس بات کا تعلق صرف ہندوستان کے باسیوں کے ساتھ ہے، جن کی روحیں بار بار جنم لیتی رہتی ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ گینداب میری کورٹ میں تھیٔ میں نے کہا کہ میں تو آیا ہی بوڑھی روحوں سے ملنے کے لئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ساتھ میری سابقہ جنموں کی دوستی یاری نکل آئے۔ شاید بوڑھا لارڈ بھی ان میں شامل رہ چکا ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا ہو اور مجھ سے اپنی قسمت کا حال جاننے کے لئے ملا ہو۔ مارلس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ کر مستقبل کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ تو میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دوسروں نے بات کو آگے بڑھایا اور تعلیوں پر تعلیاں کی جانے لگیں۔ کسی نے کہا کہ وہ محض آواز سن کر انسانوں کے کردار کا احاطہ کر سکتا ہے۔ کسی اور نے کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، وہ سونگھ کر انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارہ میں سب کچھ جان جاتا ہے۔ اس روز ہماری میز پر سب سے زیادہ قہقہے لگائے گئے اور ہم سب پہلی ملاقات میں ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔

چائے کے بعد سیمینار کا پہلا تعارفی اجلاس ہوا، جس میں منتظمین نے اپنے بارے میں بتایا اور سیمینار منعقد کرنے والی فرینڈز سوسائٹی کا تعارف کرایا۔ عرف

عام میں ان لوگوں کو کوئیکرز کا نام دیا جاتا ہے۔ان کے مذہبی عقائد کی بناء پر یورپ بالخصوص انگلستان سے ان کو ملک بدر کر دیا گیا تھا۔امریکہ میں انہوں نے ایک صلح کل پالیسی کو اپنا لیا اور اس بات کا پرچار کرنے لگے۔ سیمنار کا مقصد یہی تھا کہ دنیا کے مختلف ملکوں، قوموں اور نسلوں کے لوگوں کو یکجا کر کے ان کے باہمی مناقشات کا تجزیہ کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ جنگ سے دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر جنگ نئی بے انصافیوں کو جنم دیتی ہے اور انسانوں کے مابین فاصلوں کو بڑھاتی ہے۔جبکہ سارے مسائل صلح و آشتی کے ساتھ حل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ فریقین ایک دوسرے کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوں۔

سیمنار میں پینتیس ملکوں کے نمائندے شامل تھے، جن میں سے اکثر میری طرح یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ہندوستان کی نمائندگی جوشی کر رہا تھا، جو اس زمانے میں ہالینڈ میں پڑھتا تھا۔وہ مغربی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے ہندوستان گیا تھا۔وہ مجھے ذاتی طور پر اچھا آدمی لگا، مگر ہمارے درمیان کشمیر حائل تھا اور ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کیلئے اس مسئلہ کا کوئی حل سوچنا تھا۔ہم سے زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا اسرائیل سے آئے ہوئے ڈان اور جورج کو کرنا تھا۔ڈان یہودی تھا، چیکوسلاوکیہ میں پیدا ہوا تھا اور ماں باپ کے ساتھ ہجرت کر کے اسرائیل میں جا کر آباد ہوا تھا، جب کہ جورج فلسطینی عیسائی عرب تھا، جس کا خاندان صدیوں سے اس ملک میں آباد تھا، اور اسرائیل کے قیام کے بعد اس کو دوسرے درجہ کی شہریت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔جہاد سلامہ ایک فلسطینی مسلمان لڑکی تھی، جس کا خاندان ہجرت کر کے لبنان میں پناہ گزین ہوا تھا۔وہ اس زمانے میں قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کی طالبہ علم تھی اور اپنی خوبصورتی کے باعث ملکہ سیمنار تھی۔اس کے ہمراہ قاہرہ سے فواد رمضان آیا ہوا تھا، جو اپنی تعلیم کے خاتمہ پر صحافت میں ابتدائی تجربہ حاصل کر رہا تھا، گویا عرب کیمپ خاصا مضبوط تھا۔مگر اسرائیل کے حامیوں کی تعداد بھی کچھ ایسی کم نہ تھی، کیونکہ دو یہودی، ایک امریکن اور دوسرا کینیڈین، سیمنار میں موجود تھے۔ افریقہ کے کئی ملکوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے، جن میں گھانا کی میری اور نائیجیریا

کی روزی نمایاں تھیں ۔ پہلی میٹنگ میں ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ روڈیشیا کا ایڈوارڈ اور جنوبی افریقہ کا جونزسن کلونیل ازم اور نسلی امتیاز کے خلاف خوب معرکے ماریں گے ۔ امریکہ کی سفید فام نسل کی نمائندگی ایڈتھ کر رہی تھی، جب کہ سیاہ فام رچرڈ نہ تو باکسر تھا اور نہ ہی اتھلیٹ ۔ وہ فلاسفی کا طالب علم تھا اور ہر بات کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتا تھا ۔ کیمونسٹ یورپی ملکوں سے صرف دو نوجوان آئے ہوئے تھے، جن کا تعلق پولینڈ سے تھا اور ان کے انداز تقریر سے صاف لگتا تھا کہ پارٹی کے ممبر بلکہ شاید خفیہ پولیس کے کارکن تھے ۔ مغربی یورپ کے تقریباً ہر ملک کے نمائندے موجود تھے، جن کی دلچسپیاں زیادہ تر ان سرگرمیوں تک محدود تھیں، جو سیمینار کے پروگرام سے باہر تھیں ۔ انہیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ شاموں کو موسیقی اور ناچ کا کیسا انتظام ہے اور کب اور کن جگہوں کے تفریحی سفروں کا اہتمام کیا جائے گا ۔

یورپ میں گرمیوں کے موسم میں دن بے حد طویل ہوتے ہیں ۔ سورج کہیں نو دس بجے جا کر غروب ہوتا ہے ۔ اسی تناسب سے شامیں شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی ہیں ۔ کالج میں شام کا کھانا سات بجے لگا دیا جاتا تھا، جس کے بعد اندھیرا پھیلنے میں کئی گھنٹے پڑے ہوتے تھے ۔ چونکہ شام کو سیمینار کا کوئی پروگرام نہ ہوتا تھا، سوائے موسیقی اور ڈانسنگ کے اور ہفتہ میں ایک یا دو بار منائے جانے والے کسی کنٹری فیسٹیول کے، جس میں شامل ہونے کی شرط نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ سیر و تفریح کے لئے باہر چلے جاتے تھے ۔ پہلے ہی روز مارلس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا، بلکہ وہ کہیں سے اپنے اور میرے لئے دو سائیکلیں بھی لے آئی ۔ اس کا پروگرام ایک قریبی گاؤں میں جانے کا تھا، جس کے راستے میں ایک جنگل پڑتا تھا، جہاں سے شام کے وقت گذرتے ہوئے اسے ڈر لگتا تھا ۔ تو گویا مجھے باڈی گارڈ ہونے کا شرف بخشا جا رہا تھا ۔

یہ بات میں نے اسے راستے میں کہہ ہی ڈالی، جس پر اسے بہت ہنسی آئی ۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے ایک بہت ضروری کام کے سلسلہ میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہے، جس کا تعلق اس کی قسمت سے ہے اور یہ کہ میں اس سیمینار کے شرکاء میں سے واحد

آدمی تھا، جسے وہ اپنے راز میں شریک کر رہی تھی ۔ وہ یوں بھی چاہتی تھی کہ میں اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر بتاؤں کہ آیا اسے اپنے مقصود کو حاصل کرنے میں کامیابی ہو گی یا نہیں ۔ میرے پوچھنے کے باوجود وہ یہ بتانے کے لئے تیار نہ ہوئی کہ اس کا مقصود کیا تھا ۔ اس نے کہا کہ مجھے اس معمہ کو اکیلے حل کرنا ہو گا ۔ میں پہلے جنم میں جوتشی جو رہ چکا تھا ۔

گاؤں کے پب میں اس نے مسز میکلین کے بارہ میں پوچھا، جس کی بیوی جرمن تھی ۔ اس نام کے آدمی کو وہاں پر کوئی نہیں جانتا تھا اور کسی جرمن عورت کے بارہ میں انہوں نے نہیں سن رکھا تھا ۔ ایک شخص نے کہا کہ اس نے ایک بار ایک فارم میں ایک عورت کے ساتھ بات کی تھی، جس کا لہجہ اسے غیر ملکی لگا تھا، مگر یہ بات اتنی پرانی ہے کہ وہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فارم کہاں پر واقع ہے ۔ عورت البتہ بہت خوبصورت تھی ۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ ایسی عورتیں صرف فلموں میں دیکھنے میں آتی ہیں ۔

واپسی کے راستے میں مارلس نے بتایا کہ وہ باری باری اس کونٹی کے ہر گاؤں میں جانا چاہتی ہے ۔ وہ دراصل اس عورت کو تلاش کرنے کے لئے وہاں پر مقیم تھی، اس نے ایک نقشے پر ان تمام مقامات پر نشان لگا رکھا تھا، جہاں پر وہ جا چکی تھی ۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی بیس پچیس گاؤں باقی تھے ۔ گویا سیمینار کے چار ہفتوں کے دوران تقریباً ہر روز ایک گاؤں کا چکر لگانا ہو گا ۔ مارلس نے کہا کہ ضروری نہیں ہے کہ میں روزانہ اس کے ساتھ جاؤں ۔

میں نے کہا کہ میں ہر روز اسکے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ وہ مجھے بتائے کہ وہ کون عورت ہے، جسکی اسے تلاش ہے اور کس وجہ سے ۔ مارلس نے کہا کہ وہ مجھے کالج میں پہنچ کر ایک تصویر دکھائے گی، جس سے ساری بات کھل جائے گی ۔

تصویر پر ایک نظر ڈالنے سے میں جان گیا کہ وہ عورت مارلس کی ماں تھی ۔ دونوں کی شکل و شباہت بالکل ایک جیسی تھی ۔ ویسی ہی نیلی آنکھیں اور سنہری بال، ترشے ہوئے خدوخال، اٹھتی ہوئی ناک، بے حد رسیلے ہونٹ ۔ گویا مارلس اپنی ماں کی تلاش میں تھی، جو کسی مسز میکلین کے ساتھ اس کونٹی کے کسی گاؤں میں رہتی

تھی ۔ پب میں اس شخص نے کہا تھا کہ اسے اس عورت کو دیکھے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا تھا، جس کا لہجہ اسے غیر ملکی لگا تھا۔

مارلس نے بتایا کہ جب اسکی ماں نے اسکے باپ کو مسٹر میکلین کی خاطر چھوڑا تھا، تو اسکی عمر ایک سال کی تھی ۔ اس بات پر پورے چوبیس سال گذر چکے تھے ۔ اسکے باپ نے دوسری شادی نہ کی تھی ۔ مارلس کی پرورش ایک آیا نے کی تھی ۔ اسکی حقیقی ماں نے اتنے سالوں میں کبھی بھول کر بھی اسکے بارہ میں نہ پوچھا تھا اور نہ ہی اسکی سالگرہ پر کوئی تحفہ بھیجا تھا، جبکہ مارلس کو پتہ تھا کہ وہ اسکی سالگرہ کے دن کو نہیں بھول سکتی ۔ ماں اور بیٹی کی تاریخ پیدائش ایک ہی تھی ۔ اور اس نے مارلس کے باپ سے عین اپنی پچیسویں سالگرہ والے روز علیحدگی اختیار کی تھی ۔

مارلس کو علم نہ تھا کہ اسکی ماں کیوں اسکے باپ سے علیحدہ ہوئی تھی اور کیا وجہ تھی کہ وہ اپنی ایک سالہ بیٹی کو باپ کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی ۔ مارلس نے اپنے باپ سے اس بات کا راز جاننا چاہا، مگر وہ اس بارہ میں بات کرنے کو بالکل تیار نہ تھا ۔ اسکے دل کا چرکہ اتنا گہرا تھا کہ وہ ساری عمر بے حد غمگین رہا ۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسکی بیوی ایک عامی قسم کے انگریز سپاہی کیلئے اسکو چھوڑ گئی تھی، جو دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جرمنی میں تعینات تھا۔

مارلس کو اپنی ماں کی سہیلیوں سے پتہ چلا تھا کہ وہ انگریز اتنا بھی عام آدمی نہیں تھا، جتنا اسکا باپ اسکو باور کرانے کی کوشش کرتا تھا ۔ اسکے باپ کے برعکس، جو ہر وقت سنجیدگی کا ملمع اپنے چہرے پر کئے ہوئے پھرتا تھا، جیسے ہلکی سی مسکراہٹ بھی اسکے میک اپ کو تہہ و بالا کر دے گی اور پیچھے سے اسکا اصل چہرہ جھانکنے لگے گا، وہ انگریز بے حد خوش باش آدمی تھی ۔ وہ منٹوں کے اندر لوگوں میں گھل مل جاتا تھا اور عورتوں کا تو وہ ہیرو تھا ۔ جب وہ ڈانسنگ فلور پر قدم دھرتا تھا، تو یوں لگتا تھا، جیسے موسیقی اسکا ہیولا اختیار کر لیتی تھی ۔ سبھی عورتیں اسکے ساتھ ڈانس کرنے کی خواہش مند تھیں، مگر مارلس کی ماں نے اس پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ اسکی موجودگی میں کسی دوسری عورت کو ڈانس کرنے کی دعوت نہ دیتا تھا ۔ مارلس کے باپ نے ان روزمرہ کی شکستوں سے تنگ آکر موسیقی کی محفلوں میں جانا چھوڑ دیا تھا ۔ یوں

بھی جنگ کے بعد جرمنی پر اتحادیوں کا قبضہ تھا اور قانونی اور غیر قانونی طور پر ہر بات میں انکا سکہ چلتا تھا۔ اسکے باپ کو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ مسٹر میکلین کے روبرو کھڑے ہو کر اسے اپنی بیوی کا پیچھا کرنے سے روک سکتا۔ اگر وہ کبھی ایسا کرتا بھی تو نتیجہ اسکے حق میں اچھا نہ نکلتا، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اسکی بیوی کبھی کی اسکے قابو سے نکل چکی تھی۔ کھلم کھلا اس بارہ میں جھگڑنے سے شاید یہ ہوتا کہ وہ بھرے پب میں اسکی بے عزتی کر دیتی۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ مسٹر میکلین اسکو دنگہ فساد کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کرا دیتا۔

مسٹر میکلین کے بارہ میں عام طور سے یہ مشہور تھا کہ وہ بے حد شیخی باز تھا۔ وہ اپنے خاندان کی وسیع و عریض زرعی اراضی کا ذکر کیا کرتا تھا، جن کا وہ واحد وارث تھا۔ اگر اس کے پردادا نے کسی زمانے میں کراؤن کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کیا ہوتا اور اس کے خاندانی موروثی القابات قائم ہوتے، تو وہ "ارل آف اسٹڈلے" ہوتا۔ یہ بات اپنی جگہ پر مگر مسٹر میکلین کی جیب میں کبھی پیسے نہ ہوتے تھے۔ وہ اس بات کو اپنے خاندان کی پیسوں کے معاملے میں لاپرواہی پر محمول قرار دیتا تھا۔ اس وجہ سے اکثر مسٹر میکلین کے ساتھ پب میں بیٹھنے والوں کو یا اس کی ڈانس پارٹنر لڑکیوں کو اس کا بل ادا کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہر کسی سے وعدہ کرتا تھا کہ اگلے ہی روز قرض اتار دے گا، مگر وہ اگلا روز کبھی نہ آیا۔

پھر اس کی بٹالین کی واپسی کے آرڈر آ گئے۔ میکلین نے تو خیر انگلستان جانا ہی تھا، مارلس کی ماں نے بھی خفیہ طور پر اس کے ساتھ چلے جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا خاوند اس کے راستے میں روڑے نہیں اٹکائے گا۔ وہ اس کی جانب سے اس درجہ دل آزردہ ہو چکا تھا کہ میاں بیوی کی علیحدگی کی ناگزیری کو قبول کر چکا تھا۔ صرف مشکل یہ تھی کہ ان کی بیٹی مارلس ابھی بہت ننھی تھی۔ اس نے تو ایک سال بھی مکمل نہ کیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر مارلس کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا اور دل ہی دل میں ڈرتا تھا کہ اگر طلاق کا مقدمہ دائر کرنا پڑا، تو عدالت مارلس کی کفالت کا فیصلہ اس کی ماں کے حق میں کر دے گی۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ مارلس کی ماں نے خفیہ طور پر دو چار کپڑے لتے سنبھالے اور چپکے سے میکلین کی

بٹالین کے ساتھ انگلستان چلی گئی ۔اس دن کے بعد اس نے اپنے خاوند یا مارلس کے ساتھ کوئی واسطہ نہ رکھا ۔وہ یکسر ان کی زندگی سے نکل گئی ۔

اس دن کے بعد اسکی طرف سے کبھی کوئی خط پتر نہ آیا اور نہ ہی اس نے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کن حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی ۔ مارلس کے پاس اپنی ماں کی دی ہوئی ایک گڑیا یادگار تھی ، جسے اس نے جنگ کے زمانے میں کپڑوں کی لیروں کو جوڑ باندھ کر بنایا تھا ۔ مارلس اسے بے حد چاہتی تھی اور ہمیشہ اپنے ساتھ لئے پھرتی تھی ۔ اسٹڈلے کالج میں اس نے اسے اپنے کمرے میں بستر پر سرہانے کے ساتھ سہارا دے کر بٹھایا ہوا تھا ۔ اسکے علاوہ اسکے پاس ماں کا ایک فوٹو تھا ۔اس ماں کا جو اسے ننھی سی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور پھر بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا ۔اگر مارلس کو ماں کی سہیلیوں کی زبانی علم نہ ہوتا کہ میکلین کا خاندانی خطاب "ارل آف اسٹڈلے" تھا ، تو اسے بالکل پتہ نہ چلتا کہ وہ ماں کو کہاں پر تلاش کرے ۔ اس نے انگلستان کے نقشے پر اسٹڈلے کا سراغ نکالا ، تو پتہ چلا کہ وہاں پر ایک زراعتی کالج پایا جاتا ہے ، جہاں پر اسے ایک آدھ ماہ کیلئے رہائش مل سکتی ہے ۔

اسٹڈلے پہنچنے پر پتہ چلا کہ "ارل آف اسٹڈلے" کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا ۔ کالج کی بلڈنگ بنانے والا خاندان نصف صدی قبل کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا ۔ انکی بیشتر اراضی زراعتی کالج کے پاس تھیں ، جہاں پر ایک ماڈل زراعتی فارم بنا ہوا تھا ۔ میکلین نامی شخص کو وہاں پر کوئی نہیں جانتا تھا ۔ مگر اس بات کی ضمانت بھی کوئی نہ دے سکتا تھا کہ آس پاس کے دیہات میں اس نام کا کوئی کسان پایا جاتا ہو ۔چونکہ انگلستان میں آبادی کی سنٹرل رجسٹریشن کا انتظام نہیں ہے ، اسلئے وہاں پر کسی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے ۔

سیمینار اپنی ڈگر پر چل رہا تھا ۔ابتدائی دنوں میں ہر کوئی اپنے اپنے موقف پر یوں اڑا ہوا تھا ، جیسے اس سے ایک قدم ادھر یا ادھر ہونے سے دنیا ڈوب جانے کا خطرہ تھا ۔ سیمینار کا ڈائرکٹر مسٹر اُوور اسٹریٹ بہت ہوشیار مندی کے ساتھ مباحثوں میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتا تھا اور بہت دھیرے دھیرے فریقین کو اس مقام پر لے جاتا تھا ، جہاں پر پہنچ کر شرکاء بحث کو تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ مسئلے کا حل اس

صورت میں ممکن نہیں ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے موقف پر اڑا رہے ۔ البتہ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے چار ہفتوں کے دوران کشمیر، اسرائیل اور روڈیشیا سے لیکر جنوبی افریقہ تک سارے مسائل کو حل کر ڈالا تھا ۔ ہم نے صرف یہ سیکھا تھا کہ دوسروں کے موقف کو بھی اسی سنجیدگی کے ساتھ پرکھنا چاہیئے ، جس کی توقع ہم دوسروں سے رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے موقف کے ساتھ برتیں گے ۔

پہلا سیشن دوپہر کے کھانے تک چلتا تھا ، جسکے بعد اڑھائی تین گھنٹوں کا وقفہ آجاتا تھا ، جسکے دوران ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کر سکتا تھا ۔ اکثر لوگ کالج کے لان میں کروکے کھیلتے تھے یا سیر سپاٹے کیلئے نکل جاتے تھے ۔ میری اور مارلس کی ٹولی میں بعض اوقات مارسل شامل ہو جایا کرتا تھا ، جو بلجیم کا رہنے والا تھا چونکہ اسے جرمن نہ آتی تھی ، اسلئے ہمیں اسکی خاطر انگریزی بولنی پڑتی تھی ، جبکہ مارلس کے ساتھ میں عام طور سے جرمن زبان میں بات چیت کرتا تھا ۔ اسکا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ہمارے منصوبے دوسروں سے پوشیدہ رہتے تھے ۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ ہم شام کے وقت سائیکلوں پر کہاں جاتے اور کیا کرتے تھے ۔

مارسل بہت بور شخص تھا ۔ وہ سیر کیلئے بھی جاتا تھا ، تو تھری پیس سوٹ اور نکٹائی پہن کر ۔ میں اسکا مذاق اڑانے کیلئے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنا سیلنڈر ہیٹ ساتھ لانا بھول گیا ہے یا یہ کہ کوئی جنٹلمین چھتری کے بغیر ننگا دھڑنگا گھر سے باہر نہیں نکلتا ۔ وہ بے چارہ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور تھا یا شاید قصور اسکے پیشے کا تھا ۔ اس نے کالج کی تعلیم کے خاتمے پر ایک بنک میں اپرنٹس شپ کر لی تھی ۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بینکر بننا چاہتا تھا ، جسکا پرائیویٹ بنک بروسلز میں بہت بڑا نام رکھتا تھا ۔ میں اسے تنگ کرنے کیلئے کہا کرتا تھا کہ بینکر کا بیٹا اور ایک پرائیویٹ بنک کا وارث ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اسے اسقدر اکڑ کر چلنا چاہیئے ، جیسے اس نے بانس کا ڈنڈا نگل رکھا ہو ۔ مارلس بھی اس چھیڑ چھاڑ میں میرا ساتھ دیتی تھی ، مگر وہ اسکی باتوں کا برا نہ مناتا تھا ۔ وہ مارلس کی ایک ایک ادا پر جان دیتا تھا ۔ مگر میری موجودگی میں اسکی دال نہ گلتی تھی ۔ اسلئے اسکی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت مارلس کے ساتھ اکیلے گذارے ۔ اس معاملے میں خوش قسمتی سے یہ چیز حائل تھی کہ

مارسل کو سائیکل چلانی نہ آتی تھی۔ اس وجہ سے وہ شام کے سفروں میں ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ یوں بھی مارلس نہیں چاہتی تھی کہ اسکے معاملہ کا دوسروں کو پتہ چلے۔

یہ راز اسکے اور میرے درمیان تھا۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا، جسکے دوران ذرہ بھر پیش قدمی نہ ہو رہی تھی، ہمارے حوصلوں پر اوس پڑتی جا رہی تھی۔ ہر شام کو کسی مہم سے ناکام لوٹنا آدمی کو جان سے مار ڈالتا ہے۔ میری دلچسپی اس معاملے میں محض دوستانہ تھی، اسلئے ناکامیوں کا اثر مجھ پر اتنا گہرا نہ تھا جتنا مارلس پر۔ اسکے ولولے اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالنے کے دن بدن ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے۔ اس دوران میں اسٹڈلے میں ہمارے قیام کا آخری ویک اینڈ آن پہنچا۔ ہفتے کے روز ہم نے نقشے پر باقی ماندہ آخری گاؤں کا چکر لگایا اور حسب دستور ناکام لوٹے۔ اتوار کا دن میں مارلس کے ساتھ اکیلا گذارنا چاہتا تھا اور مارسل کو، جو تہوار کے دنوں میں ہمارے ساتھ سریش کی طرح چپک جایا کرتا تھا، کسی طریق سے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا، ہفتے کی شام کو میں نے مارلس سے نظر بچا کر ایک پب سے اسٹڈلے کالج میں فون کیا اور آواز کو بدل کر فرانسیسی لہجے میں مارسل کیلئے یہ پیغام چھوڑا کہ اسکے ماں باپ اتوار کے روز لندن پہنچ رہے ہیں، جہاں پر وہ برسٹل ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مارسل اتوار کا دن انکے ساتھ لندن میں گذارے۔ ہمارے کالج میں واپس پہنچنے تک مارسل کو پیغام مل چکا تھا اور اس نے اگلی صبح پہلی بس میں لندن جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دلا دی کہ محبت اور جنگ میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے۔

بات دراصل محبت کی ہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ مارلس کے سامنے اسکا اقرار کر لیا جائے۔ اس مقصد کیلئے بہت سا وقت درکار ہوتا ہے۔ انسان پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے یا کسی بنچ پر بیٹھے ہوئے یا گھاس میں لیٹے ہوئے تو محبت کا اظہار کر سکتا ہے، مگر سائیکل چلاتے ہوئے یا مارسل کی موجودگی میں ایسی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ اسلئے میں چاہتا تھا کہ ہم اتوار کے روز پیچ ہائیکنگ کیلئے نکلیں۔ دوپہر کے کھانے کی بجائے لنچ پیکٹ بنوالئے جائیں اور سارا دن کھیتوں میں، گھومتے پھرتے ہوئے گذاریں

مجھے امید تھی کہ دن کے دوران کوئی نہ کوئی مناسب موقعہ نکل آئے گا، جب میں مارلس کو سینے سے لگا کر یا اسکا ہاتھ پکڑ کر اپنی محبت کا اظہار کر سکوں گا۔

اتوار کے روز ناشتہ کسی قدر دیر سے ملتا تھا۔ مارسل ناشتے کا انتظار کرنے کے بغیر پہلی بس میں لندن کیلئے روانہ ہو گیا۔ اسے راستے میں دو بار بس بدلنی تھی۔ اور اگر خلاف توقع کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی، تو اسے گیارہ بجے سے پہلے لندن پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ جب تک اسے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کسی نے اسکے ساتھ مذاق کیا ہے اور وہ واپسی کیلئے بس پکڑتا ہے، ہم اسٹڈلے کے گرد و نواح میں کہیں کے کہیں جا چکے ہوں گے۔ ہمارا ارادہ سارا دن باہر گذارنے کا تھا۔

اسٹڈلے کے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک ندی بہتی ہے، جسکے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ انسان اسکے کنارے کنارے چلتا ہوا اسٹریٹفورڈ اپون ایون پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں راستے میں ایک شخص ملا، جسے ہم اس سے قبل متعدد بار ندی پر مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس ندی میں سرے سے مچھلیاں پائی ہی نہیں جاتیں۔ اسٹڈلے سے تھوڑا اوپر ایک کیمیکل ورکس بنا ہوا تھا، جسکا استعمال شدہ پانی فلٹر ہونے کے بغیر ندی میں گرتا تھا۔ اس جگہ پر سفید جھاگ کے سبب انسان ندی کے پانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسلیئے میں نے مچھلی کے شکاری سے جاننا چاہا کہ وہ اتوار کے اتوار کتنی مچھلیاں شکار کر لیتا ہے۔

اس نے جواب دیا کہ مچھلیوں کا شکار تو محض ایک بہانہ ہے۔ دس برسوں کے دوران اس نے ایک بھی مچھلی نہ پکڑی تھی۔ دراصل وہ شخص شیکسپیر کا عاشق تھا، اسے یقین تھا کہ شیکسپیر اس گرد و نواح کی ندیوں پر مچھلیوں کا شکار کرتا رہا ہو گا۔ اسلیئے ہر اتوار کو وہ کسی دوسری جگہ پر جا کر بیٹھتا تھا۔ اور عین ممکن ہے کہ شیکسپیر نے کبھی وہاں پر مچھلیوں کا شکار کرنے کیلئے ڈیرہ لگایا ہو گا۔ اس نے شرارت آمیز نگاہوں کے ساتھ مارلس کی طرف تکتے ہوئے کہا کہ شیکسپیر نے یقیناً اس ندی کے آس پاس اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لے کر اسکے ساتھ بوس و کنار کیا ہو گا۔

ہم نے اسے خدا حافظ کہا اور ندی کے کنارے کنارے چل دیئے۔ وہاں سے لگ بھگ ایک کلو میٹر گئے ہوں گے کہ لینڈ اسکیپ کے عین بیچ ایک ننھا منا سا چرچ

کھڑا نظر آیا ۔ وہاں پر دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی ۔ بیک گراونڈ میں بڑے گرانڈیل درخت کھڑے تھے ۔ ایک طرف یہ نظارہ ایسا دلفریب تھا، جیسے اسے کسی مصور نے خاص طور پر تخلیق کیا ہو، دوسری طرف وہ ایسا غیر فطری لگ رہا تھا، جیسے کسی جادوگر نے اسے فریب نظر کے عمل سے بنایا ہو ۔ اور جونہی ہم اسکی سمت میں چلنا شروع کریں گے، ساری سبزی پیچھے ہٹنے لگے گی اور ہم کبھی چرچ تک نہ پہنچ پائیں گے ۔

پھر جب ہم نے سچ مچ چرچ کی طرف اپنے قدموں کا رخ موڑا، تو ہر چیز اپنی جگہ پر قائم رہی ۔ بلکہ ہمیں یوں لگا، جیسے چرچ ہماری طرف بڑھتا چلا آتا تھا ۔ ہماری رفتار میں تیزی پیدا ہوتی چلی گئی اور آخری ایک سو گز کا فاصلہ تو ہم نے دوڑ کر طے کیا، بغیر ایک دوسرے کے ساتھ شرط لگانے کے ہم نے دوڑنا شروع کر دیا تھا، جیسے چرچ کے دروازے پر کوئی انعام ملنے والا تھا ۔ جب راستے میں مارلس کا دم پھولنے لگا، تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دوڑ کی رفتار کو کم کر دیا ۔ اس وقت تک ہمیں علم نہ تھا کہ چرچ کا دروازہ کھلا ہو گا یا بند ۔ مارلس نے کہا کہ مزا تو تب ہے کہ دروازہ کھلا ہو اور اندر سروس ہو رہی ہو ۔ آخر وہ اتوار کا روز تھا اور وقت چرچ سروس کے لئے موزوں تھا ۔

مارلس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی ہتھی کو پکڑا اور کسی قدر بے دلی کے ساتھ دروازے کو اپنی طرف کھینچا، جو کھلتا چلا گیا ۔ اندر پلپٹ کے دائیں بائیں موم بتیاں جل رہی تھیں، جیسے کسی نے انہیں ہمارے استقبال کے لئے روشن کیا ہو ۔ کھڑکیوں سے روشنی چھن کر اندر آرہی تھی ۔ بیٹھنے کے لئے دورویہ لکڑی کے تین تین بنچ رکھے ہوئے تھے ۔ چرچ فی الواقعہ بے حد مختصر تھا ۔ اور اگرچہ ہمارا قیاس تھا کہ سروس میں شاید ہی کوئی شخص حصہ لینے کے لئے آئے گا، اس کے باوجود صاف نظر آرہا تھا کہ اس صبح سروس کے سارے انتظامات کئے جا چکے تھے ۔ مگر وہاں پر کوئی پادری نہیں تھا ۔ پھر مارلس نے نوٹ کیا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ تھا، جب کہ اس سارے علاقے میں رومن کیتھولک آبادی نہ پائی جاتی تھی ۔ مارلس کا تعلق رومن کیتھولک فرقے سے تھا ۔ اس کی تیز نظروں نے ایک کونے میں وہ کرسی بھی تلاش کر

لی ، جو کنفیشن کے لیئے استعمال ہوتی ہے ۔ حیرت صرف اس بات کی تھی کہ پادری کی عدم موجودگی میں کسے کنفیشن لینے کا حق حاصل تھا اور وہ کون لوگ تھے ، جو اس گرجا گھر سے منسلک تھے ۔ فرنیچر اور دوسری چیزوں کی دیکھ بھال اتنی اچھی تھی کہ ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ گرجا گھر بلا مقصد اور بغیر محافظ کے لینڈ اسکیپ کے بیچوں بیچ کھڑا تھا ۔

کنفیشن کی کرسی نے میری مشکل کو آسان کر دیا ۔ میں نے مارلس کو اس پر بٹھا کر اپنے گناہِ محبت کا اقرار کیا اور وعدہ کیا کہ اس کو ساری عمر ہاتھوں پر اٹھاؤں گا ۔ مارلس نے پوچھا کہ کیا مجھے پتہ ہے کہ گرجا گھر کے اندر ایسے عہد و پیمان کر کے انسان ان کو نہیں توڑ سکتا ۔ میں نے کہا کہ میرا وعدہ ہمیشہ کے لیئے ہے اور آنے والے ماہ و سال ثابت کر دیں گے کہ میں وعدے کا پکا ہوں ۔

اب میری باری کنفیشن کی کرسی پر بیٹھنے کی تھی ۔ مارلس نے کہا کہ وہ بھی بہت دنوں سے مجھے بتانا چاہتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیئے میری ہو چکی ہے اور اب کوئی چیز ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے گی ۔

میں نے خوشی کے مارے مارلس کو بازوؤں میں لے کر چیلپٹ کے سامنے چوما ، جو گویا ہمارے عہد و پیمان پر مہر تصدیق تھی ۔

گرجا گھر سے نکل کر ہم نے نہر کے کنارے اپنے سابقہ بے منزل سفر کو جاری رکھا ۔ پروگرام صرف اس قدر طے شدہ تھا کہ اتنی دیر تک چلیں گے ، جب تک بھوک کی شدت ہمیں رکنے اور لنچ پیکٹ کھولنے پر مجبور نہیں کرتی ۔ ہلکی ہلکی چتکبری سی دھوپ نکل آئی تھی اور لینڈ اسکیپ کے رنگوں میں تازگی آ گئی تھی ۔ مارلس کو اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ وہ کیمرہ ساتھ نہ لائی تھی ۔ اسے یقین تھا کہ ایسا نظارہ انسان کو زندگی بھر میں بس ایک بار دیکھنے کو ملتا ہے ۔ میری یادداشت کی لوح پر سارا نظارہ آج تک تازہ ہے ، اپنے سارے رنگوں ، خوشبوؤں اور پرندوں کی آوازوں سمیت ۔ اور لینڈ اسکیپ میں جڑے ہوئے ننھے سے گرجا گھر کے سامنے کھڑی مارلس اس نظارے میں روح پھونک رہی ہے ۔

ابھی ہم زیادہ دور نہ گئے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا ایک مرد اور عورت کے ساتھ

ہوا، جو شاید گرجا گھر جا رہے تھے۔ مرد کسی قدر جھک کر چل رہا تھا۔ البتہ اسکے چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی جوانی میں ایک بڑا گبرو رہا ہوگا۔ عورت کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اسکے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ اور عرصہ ہوا انکو کسی ہیر ڈریسر نے ہاتھ نہ لگایا تھا۔ دراصل مارکس اور میں اپنے پیار کے اظہار میں اس درجہ مصروف تھے کہ اگر عورت نے ہمیں مخاطب نہ کیا ہوتا، تو ہمیں شاید پتہ ہی نہ چلتا کہ کوئی ہمارے پاس سے گذرا تھا۔

"ہائے، آپ میرے وطن کی زبان بول رہے ہیں"۔

عورت کے اس فقرے نے ہمیں چونکا دیا اور ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ عورت نے سورج کی شعاعوں سے بچنے کے لئے اپنے دائیں ہاتھ سے آنکھوں کے سامنے چھجا سا بنایا ہوا تھا اور ہمیں چندی آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ تک رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے کئی دانت گر چکے تھے اور دوسروں کو کیڑا لگا ہوا تھا۔

میں نے بتایا کہ ہم ایک سیمینار کے سلسلہ میں اسٹڈلے کالج میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے جاننا چاہا کہ وہ کب سے انگلستان میں مقیم تھی۔

"اس بات پر ایک عمر گذر چکی ہے"۔ عورت نے کہا۔ پھر اس نے اپنے مرد کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا" میں پیٹر کی خاطر گھر بار سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ مگر اس سارے عرصے میں مجھے اس بات پر ایک لمحے کے لئے بھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اگرچہ ہمیں اس علاقے میں بہت سی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ ابھی کل ہی میری نظر کی عینک ٹوٹ گئی ہے، جس کے بغیر میں کسی میدانی چوہے کی طرح اندھی ہو جاتی ہوں، جس کی آنکھیں سرما کے مہینے زمین کے نیچے گذارنے کے سبب جواب دے جاتی ہیں۔ اگر پیٹر مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نہ لاتا، تو آج ہم گرجا گھر میں سروس کے لئے بھی نہ پہنچ پاتے"۔

میں نے بتایا کہ ہم سیدھے گرجا گھر سے آ رہے ہیں، جہاں پر سروس کی تیاریاں مکمل ہیں۔

عورت نے کہا" یہ سب پیٹر کا کیا کرایا ہے۔ یہ اتوار کے روز سویرے سویرے وہاں پر جا کر موم بتیاں جلا دیتا ہے کہ شاید کوئی راہ گزر سروس کے لئے

رک جائے"۔

پھر کسی قدر وقفے کے بعد اس نے بتایا کہ گرجا گھر کو پیٹر نے اپنی زمینوں میں خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا تاکہ اسے اتوار کے روز چرچ سروس کے لئے پرائے گرجا گھروں میں نہ جانا پڑے۔ اس نے کہا کہ شاید ہم نے نوٹ کیا ہوگا کہ وہ کیتھولک گرجا گھر ہے، جب کہ دور دور تک وہاں پر کیتھولک آبادی نہیں پائی جاتی، پہلے وقتوں میں ایک کیتھولک پادری بیس میل کا فاصلہ سائیکل پر طے کر کے سروس کرانے کے لئے آیا کرتا تھا۔ مگر اب وہ بے حد بوڑھا ہو چکا ہے۔

مارلس اس گفتگو کے دوران مبہوت کھڑی رہی، جیسے اسکی زبان ماری گئی ہو، میں نے دیکھا کہ اسکی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔ اسکے ہاتھوں کا دباؤ میرے بازو پر بڑھتا جا رہا تھا اور اسکی انگلیاں میرے گوشت میں کھبتی جا رہی تھیں۔

میں نے دو چار باتیں کر کے گفتگو کو ختم کیا اور رخصت چاہی، کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مارلس چیخ مار کر رونا نہ شروع کر دے۔ چیخ کو تو اس نے دبا لیا، مگر اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، جسکو تھمتے تھمتے بہت وقت لگا۔ مارلس نے اپنی ماں کو دیکھ لیا تھا، جسکے دل میں ماں کے جذبات عرصہ ہوا دم توڑ چکے تھے۔ یہ وہ ماں نہ تھی، جس سے ملنے کی خواہش اسکو انگلستان لے کر آئی تھی اور جسکی خاطر اس نے ساری کونٹی کو چھان مارا تھا۔ ماں سے ملاقات اس کیلئے خوشی کا موجب نہ بنی تھی، بلکہ صدمے کا، جس سے سنبھلنے کیلئے بہت وقت درکار تھا۔

ہماری پیار و محبت کی باتیں اس صدمے کا شکار بن گئیں۔ مارلس کی ماں سے مٹھ بھیڑ سے پہلے ہم اپنی آئندہ زندگی کے بارہ میں منصوبے بنا رہے تھے۔ مارلس نے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہمبرگ میں کوئی مناسب ملازمت تلاش کر لے گی تا کہ ہم روزانہ ایک دوسرے سے مل سکیں۔ اب ہماری گفتگو کا مرکز مارلس کی ماں بن گئی، جس کے بارے میں میری رائے شروع سے اچھی نہ تھی۔ اب مارلس ماں کی تصویر کی توڑ پھوڑ میں مصروف تھی، جسے اس نے طویل سالوں میں بنایا تھا۔ یہ عمل بے حد تکلیف دہ ہے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے بہت ہمت اور وقت درکار ہوتا ہے۔

شام کو ہم واپس لوٹے تو مارلس ماں کو اپنے پیچھے چھوڑ چکی تھی ۔ اب اسے اپنے باپ میں خوبیاں نظر آنے لگی تھیں، جبکہ اس سے پہلے وہ اسے ماں کو گھر سے نکلنے کا ذمہ دار سمجھتی تھی ۔ دوسری طرف اس نے دوسری شادی نہ کی تھی اور شاید دل ہی دل میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ وہ کسی روز اچانک واپس لوٹ آئے گی ۔ انسان بھی عجیب شے ہے ۔ وہ اپنی زندگی موہوم امیدوں کے سہارے پر گذار سکتا ہے ۔ وہ آنکھیں میچ لیتا ہے، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے اور منہ کو سی لیتا ہے ۔

اس شام مارلس کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کرنا چاہتی تھی ۔ مجھے چونکہ سارے قصے کے پس منظر کا علم تھا، اس لئے میں تو چپ ہو رہا ۔ مگر مارسل کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا ۔ وہ سارا دن لندن میں خجل خراب ہو کر لوٹا تھا اور اب مارلس شام اس کے ساتھ گذارنے کے لئے تیار نہ تھی ۔ کم از کم اس کے لئے یہ امر تسلی بخش تھا کہ اس شام مجھے بھی مارلس کی مصاحبت حاصل نہ تھی ۔

اگلا روز سیمینار کے خاتمے کا تھا ۔ پہلا سیشن ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے تک ہونا تھا اور دوسرا پچھلے پہر ۔ میں نے اس روز کی کاروائی میں زور و شور کے ساتھ حصہ لیا اور امریکی سیاہ فاموں کے حقوق کی سلبی اور اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی پر بھرپور حملے کئے، جب کہ سیمینار کے ڈائرکٹر مسٹر اوور اسٹریٹ اس روز صرف صلح کن باتیں سننا چاہتے تھے ۔ انہوں نے دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجنے پر مجھے روک لیا اور اپنے ساتھ آفس میں لے گئے ۔ انہوں نے کہا کہ وہ چار ہفتوں تک میری تقریروں سے محظوظ ہوتے رہے تھے ۔ مگر اس صبح میں نے جس جارحانہ انداز میں باتیں کی تھیں، اس سے سیمینار کا اصل مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے ۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ پچھلے پہر کے سیشن میں دوسروں کو بولنے کا موقعہ دوں ۔

میں مسٹر اوور اسٹریٹ کے آفس سے بھیگی ہوئی بلی کی طرح نکلا اور سیدھا ڈائننگ ہال میں پہنچا، جہاں پر ایک دوسری شکست میری راہ تک رہی تھی ۔ میری غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مارسل میری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جو مارلس کے پہلو میں تھی ۔ مجھے مجبوراً اس کی کرسی پر بیٹھنا پڑا ۔ اس میز کے دوسرے لوگ سویٹ ڈش

کھا رہے تھے ۔اور پیشتر اس کے کہ میں پہلا کورس ختم کرتا، وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے میرے کھانا ختم کرنے تک مارلس اور مارسل کہیں باہر جا چکے تھے ۔ میرا موڈ اس وقت یوں بھی کسی کے ساتھ باتیں کرنے کا نہ تھا ۔میں اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدلے بغیر بستر پر لیٹ گیا ۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام کے کھانے کی گھنٹی بج رہی تھی ۔ گویا میں نے پچھلے پہر والا سیشن سو کر گنوا دیا تھا ۔ مسٹر اُوور اسٹریٹ ڈائننگ ہال کے دروازے پر کھڑے میری راہ تک رہے تھے ۔ انہیں خیال گذرا تھا کہ میں نے ان کی بات کا برا منایا تھا، اس لئے پچھلے پہر والے سیشن میں شامل نہ ہوا تھا ۔وہ مجھے اپنے ساتھ اپنی میز پر لے گئے ۔ پھر ایک بار مارسل کو میری کرسی پر بیٹھنے کا موقعہ مل گیا ۔ مسٹر اُوور اسٹریٹ کے ساتھ باتوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا اور کھانے کے ختم ہونے کے بعد دیر تک جاری رہا ۔ اس دوران میں سب لوگ ادھر ادھر بکھر گئے ۔ میں مارلس کو کہیں پر تلاش نہ کر پایا ۔خدا جانے مارسل اسے کہاں پر لے گیا تھا ۔

اس رات الوداعی پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا، جس میں مجھے جادوگر کا رول کھیلنا تھا ۔ مجھے کالج کے زمانے کے دو چار کرتب آتے تھے، جو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے ۔ کسی نے مزاحیہ نظم لکھ رکھی تھی، تو دوسروں نے کوئی اور پروگرام پیش کرنا تھا ۔ نصف شب کے بعد ڈانسنگ پارٹی ہونی تھی، جسکا اختتام اگلی صبح جا کر ہونا تھا ۔ اس رات کوئی بھی سونے کے موڈ میں نہ تھا ۔ مارلس ایک ایسے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی، جسکے ایک طرف دیوار تھی اور دوسری طرف مارسل بیٹھا ہوا تھا ۔ اس طرح میرے لئے مارلس تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہ تھا ۔

پھر مارلس کے دل میں خدا جانے کیا بات آئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آ بیٹھی ۔ اس وقت پروگرام اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا ۔آدھی رات ہونے والی تھی ۔ موسیقار اپنے اپنے آلات موسیقی کی ٹیوننگ میں لگے ہوئے تھے ۔ میں نے اس کونے پر نظر دوڑائی، جہاں پر مارلس اور مارسل ساری شام اکٹھے بیٹھے رہے تھے ۔ مارسل کی کرسی خالی تھی ۔

مارلس نے کہا کہ اس نے اپنی ماں سے ملاقات پر بہت غور و فکر کیا ہے ۔ پہلے

تو اسکو ماں پر غصہ آیا تھا کہ وہ اپنے خاوند اور بیٹی کو چھوڑ کر چلی گئی تھی ۔ مگر پھر اسکے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ ماں کا فیصلہ درست تھا ۔ اگر وہ اپنے خاوند کے پاس رہ گئی ہوتی ، تو ساری عمر مسٹر میکلین کی جدائی پہ آنسو بہاتی رہتی ۔ اب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ اور اپنے کانوں سے سن لیا تھا کہ اس نے مسٹر میکلین کے پہلو میں خوشی و مسرت کی زندگی گذاری ہے ۔ اس وجہ سے اس نے اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگلے روز مارسل کے ساتھ بلجیم جا رہی ہے ۔

عین اس وقت بتیاں گل کر دی گئیں اور مارسل برتھ ڈے کیک اٹھائے ہوئے ہال میں داخل ہوا ۔ اس پر پچیس موم بتیاں جل رہی تھیں ۔ سب نے کھڑے ہو کر "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" الاپا ۔ اس روز مارلس کی پچیسویں سالگرہ تھی ۔

(پینے برگ (جرمنی) ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء)

لینڈ لیڈی

پھر ایک بار میں لمبے وقفے کے بعد وطن واپس لوٹا تھا۔ میرے عزیز مجھے رواج کے مطابق گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے آباء واجداد کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے لے گئے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ قبرستان کے گرد چار دیواری بنا دی گئی ہے اور لوہے کا گیٹ لگا ہوا ہے۔ پرانی قبریں، جنہیں میں پہلے وقتوں سے جانتا تھا، بدستور کچی تھیں، مگر نئی قبریں پکی بنی ہوئی تھیں اور ان پر سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے تھے؛ قبروں کی قطاروں کے درمیان پھولدار پودوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں اور قبرستان کا ماحول بے حد خوشگوار لگ رہا تھا، جس میں قبرستانوں والی سوگواری نام کو بھی نہ تھی۔ پہلے وقتوں میں کیکر کے پیڑوں اور جنگلی جھاڑیوں کے سبب قبرستان بالکل اجاڑ لگتا تھا، جس میں انسان دن کے وقت بھی داخل ہونے سے ڈرتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں قبرستان کا کوئی چوکیدار نہ تھا، اس وجہ سے پرانی قبریں اکثر ٹوٹ پھوٹ کر ڈھے جاتی تھیں اور بہت بھیانک صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ اب کے میں نے دیکھا کہ کوئی گری ہوئی قبر نظر نہ آتی تھی۔ پورے رقبے پر مٹی ڈال کر زمین کو ہموار کر دیا گیا تھا۔ قبرستان میں یہ خوشگوار تبدیلی دیکھ کر مجھے بے حد حیرت اور مسرت ہوئی۔ مگر مجھے اس وقت تک پتہ نہ تھا کہ گاؤں میں اس سے بڑھ کر حیران کن تبدیلیاں میری راہ تک رہی تھیں۔

سب سے پہلی چیز، جو میں نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ گاؤں میں بجلی آ گئی تھی؛ اور اکثر مکانوں کے اوپر لگے ہوئے انٹینے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ گھروں میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو لگے ہوئے تھے۔ میرے بچپن کے دنوں میں گاؤں میں بجلی نہ

آئی تھی اور ٹیلی ویژن تو اس زمانے میں ابھی ہمارے ملک میں پہنچا ہی نہ تھا۔ شہروں میں لوگوں کے گھروں میں اکا دکا ریڈیو سیٹ ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں پہلا ٹرانسسٹر میرے ایک چچا، جو سیلانی آدمی تھے، یورپ کے کسی سفر سے لائے تھے۔ مگر وہ ابھی بہت ابتدائی سٹیج پر تھا۔ ریڈیو سگنل تک رسائی کی خاطر انہوں نے حویلی کے عین درمیان اگے ہوئے کیکر کی چوٹی پر انٹینا لگایا تھا۔ پھر بھی دن کے وقت کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف رات کے وقت بہت توجہ سے سننے سے انسان بے حد مدہم آواز میں ریڈیو نشریات سن سکتا تھا۔

دوسری چیز، جو میں نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ گاؤں کی گلیوں کو اینٹوں سے پختہ کر دیا گیا تھا اور جگہ جگہ اسٹریٹ لائٹ کے بلب لگے ہوئے تھے۔ ہمارے خاندان کی حویلیاں اور مکانات تو خیر ہمیشہ سے پکے تھے، میں نے دیکھا کہ دوسرے مکانات بھی پختہ بن چکے تھے، جو پہلے وقتوں میں پتھروں اور گارے سے بنے ہوئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ مجھے گاؤں کے گرد و نواح میں بن جانے والے بنگلوں کو دیکھنے کے لئے جانا چاہیئے، جن کے نقشے یورپ سے بن کر آئے تھے۔ ان کے بنوانے والے ہمارے گاؤں کے وہ باسی ہیں، جو یورپ میں مقیم ہیں، مگر گاؤں سے اپنی وابستگی کو زندہ رکھنے کے لئے وہاں پر مکان ضرور تعمیر کراتے ہیں۔

مولوی سعید ہمارے گاؤں کا پہلا شخص تھا، جو نوکری کرنے کی خاطر انگلستان گیا تھا۔ اس کا باپ مسجد کا امام الصلوٰۃ تھا اور اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی پیشہ کے لئے تیار کیا تھا۔ اس نے خود اسے قرآن پڑھایا تھا اور نماز و روزہ کے احکام سکھائے تھے اور دوسری ساری باتیں بتائی تھیں، جن کا جاننا ایک مولوی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جو کور رومال تو خیر اس کے کاندھے پر ہمیشہ سے ہوا کرتا تھا۔ داڑھی نکل آنے پر وہ سچ مچ کا مولوی لگنے لگا تھا۔ باپ نے چھوٹے بچوں کو بغدادی قاعدہ پڑھانے کا کام اس کے سپرد کر دیا تھا۔ اس طرح وہ نہ صرف باپ کا ہاتھ بٹانے لگا، بلکہ دھیرے دھیرے اس کی جانشینی کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ ان کی مسجد سڑک کے کنارے پر واقع تھی اور سڑک پر سے گذرنے والے اونٹوں اور خچروں کے کارواں، جو اس زمانے میں مال برداری کا کام کرتے تھے، اس مسجد کے کنویں سے پانی بھرنے

کے لئے رکا کرتے تھے ۔ بعض اوقات کوئی اکا دکا مسافر رستے میں رات پڑ جانے پر مسجد میں ٹھہر جاتا تھا۔ اس کے لئے خورد ونوش کا سامان گاؤں کے گھروں سے لانے کا کام مولوی سعید کے سپرد تھا۔ خود اس کے خاندان کی روٹی بھی گاؤں کے باسیوں کے ذمہ تھی ۔ البتہ اس کے باپ نے آہستہ آہستہ تھوڑی بہت زمین خرید لی تھی اور کھیتی باڑی بھی کرنے لگا تھا۔ اس طرح کچھ زائد آمدنی پیدا ہونے لگی تھی ۔ مگر مولوی سعید اس بات سے مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نکل آئے ۔ چنانچہ اس نے سڑک کے کنارے مسجد کے ساتھ ایک کوٹھڑی بنا کر اس میں چائے خانہ کھول دیا۔ شہر تک سواریاں پہنچانے والی موٹروین پر آکر رکنے لگی اور تانگوں کا اڈا بھی اسی جگہ پر بن گیا۔ چائے خانہ کے باہر دو چار پائیاں اور دو تین کرسیاں پڑی رہتی تھیں اور چلم اور حقہ ہر وقت موجود رہتے تھے ۔ آنے جانے والے لمحہ بھر کے لئے رک کر ایک آدھ سوٹا لے لیا کرتے تھے ۔ انہیں میں سے کسی نے مولوی سعید کو انگلستان کے بارے میں بتایا تھا ، جہاں پر دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور مزدوروں کی بے حد مانگ ہے ۔ اور پھر ایک روز مولوی سعید چپکے سے چلا گیا تھا۔ ایک عرصہ تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں پر ہوتا ہے اور کیا کرتا ہے ۔ چائے خانہ کا کام اس کے چھوٹے بھائی نے سنبھال لیا اور وہی باپ کا ہاتھ مسجد کے کاموں میں بنانے لگا۔ اس طرح پانچ برس گذر گئے ۔ اس دوران میں اس کا باپ مر گیا۔

پھر ایک روز اچانک مولوی سعید واپس لوٹ آیا۔ پتہ چلا کہ وہ بلیک برن کے کوئلے کی کانوں میں مزدوری کرتا رہا تھا۔ مگر اس کے جلد دولت مند بن جانے والے سارے خواب ٹوٹ گئے تھے ۔ پاکستان کے حساب سے وہ وہاں پر خوب پیسے کماتا رہا تھا ، مگر خرچ وہاں پر انگلستان کے حساب سے کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے جب وہ واپس لوٹا ، تو اس کے پلے کوئی دولت نہ تھی ۔ جب وہ موڈ میں ہوتا تھا ، تو انگریز میموں کے قصے سنایا کرتا تھا ، جو دیسی لوگوں کو بہت پسند کرتی ہیں ۔ اگر وہ چاہتا ، تو شادی بھی کر سکتا تھا۔ دو تین میموں نے اس کا بہت پیچھا کیا تھا۔ مگر وہ اسے قابو میں نہ کر سکی تھیں ۔ پھر دھیمی آواز میں ، جیسے اسے خطرہ ہو کہ کہیں اس کا باپ اس کی بات کو سن نہ لے ، وہ اپنی فتوحات کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اس وجہ سے مولوی سعید

کا چائے خانہ گاؤں کے بے فکروں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔اس کی باتیں سن سن کر ہر جوان آدمی کے دل میں اس جنت ارضی میں جانے کی خواہش پیدا ہونے لگی ۔ وہ لوگ مولوی سعید سے سنے ہوئے قصوں کی صداقت کے اس درجہ قائل ہو چکے تھے کہ اپنے بزرگوں کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ لالہ خان بہادر اور دوسرے بڈھے ، جو پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں میں حصہ لے چکے تھے اور یورپ تک گھوم پھر آئے تھے ، مولوی سعید کی باتوں کے سحر کو توڑنے میں ناکام رہے۔

اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے کچھ لڑکے نیوی میں ملازم تھے ۔ان کے جہاز گاہے بگاہے مرمت کی خاطر یا ٹریننگ کے پروگراموں کے سلسلہ میں انگلستان جاتے رہتے تھے ۔ایک روز خبر آئی کہ ایک جہاز کا سارا عملہ لیورپول میں اپنے جہاز کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا ۔انہوں نے قرب وجوار کے شہروں میں رہائش اور ملازمت تلاش کر لی تھی اور وہیں پر رہ گئے تھے ۔ ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا بھی ان بھگوڑوں میں شامل تھا ۔لمبے عرصہ تک اس کا کوئی خط نہ آیا ۔ کیونکہ اس بات کا خطرہ تھا کہ حکومت کو اس کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا ، تو پولیس اس کو گرفتار کر کے انگلستان سے واپس کر دے گی ۔ مولوی سعید نے انگلستان میں اپنے واقف کاروں کے ساتھ مل کر گاؤں کے لڑکوں کو بھجوانے کا بندوبست کیا ۔پہلے پہل یہ سروس دوستی یاری میں چلتی رہی ، پھر باقاعدہ ایجنسی کی صورت اختیار کر گئی ۔ مولوی سعید کو آمدنی کا ایک نیا ذریعہ مل گیا اور گاؤں کے لڑکے بالے انگلستان میں جا کر مزدوری کرنے لگے۔

جب میں جرمنی میں اپنی تعلیم کی تکمیل پر چند ہفتوں کے لئے پاکستان آیا ، تو گاؤں میں رشتہ داروں نے میری بہت عزت داری کی ۔ باری باری سب گھروں میں دعوتیں دی گئیں ۔ ماسٹر قربان ، جس کے ساتھ ہماری دور کی رشتہ داری تھی ، آؤ بھگت کرنے میں سب سے آگے آگے تھا ۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر جرمنی کے حالات پوچھتا رہا ۔ آخر تان اس بات پر آن کر ٹوٹی کہ وہ مجھ سے جرمنی ساتھ لے جانے کا خواہشمند ہوا ۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی اچھی بھلی زمینداری تھی ۔ پھر وہ ایک قریبی گاؤں کے مدرسہ میں استاد تھا ، جہاں سے اسے ماہوار آمدن ہو جاتی تھی ۔ میں نے اسے کہا

کہ جس شخص کی گذر اوقات گھر بیٹھے اچھی خاصی ہو رہی ہو، اسے بھلا سات سمندر پار جا کر مزدوری کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور بالآخر اس نے اپنی دانست میں سب سے اہم دلیل دی ۔ اس نے کہا کہ گاؤں کے بہت سے لڑکے انگلستان میں جا کر دولت کما رہے ہیں ۔ ان کے ساتھ اس کی دوستی اور بھائی چارہ ہے جب وہ لوگ کسی شادی بیاہ کے سلسلہ میں گاؤں میں آتے ہیں اور ناچ گانے کی محفل لگتی ہے، تو اسے ایسے موقعوں پر بے حد شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے ۔ کیونکہ وہ اپنے ہاں کے دستور کے مطابق اپنے دوستوں کے نام پر ایک یا دو روپے کی بیل دیتا ہے ۔ جب کہ اس کے انگلستانی دوست دس روپے کی بیل اس کے نام پر دیتے ہیں ۔ جب مراثی اس بات کا اعلان کرتا ہے، تو وہ شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا ہے، کیونکہ اس کی مالی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ پوری رات تک ان کے مقابلے میں دس دس روپے کی بیلیں دے سکے ۔ اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ جرمنی جا کر خوب پیسے کمائے اور جب اگلی بار اس کے انگلستانی دوست دس روپے کی بیلیں دیں، تو وہ بیس بیس روپے کی بیلیں دے کر ان سے بدلہ لے ۔ مجھے اس کی بات پر بہت ہنسی آئی اور میں نے کہا کہ یہ بھی خوب رہی کہ تم مراثیوں کو بیلیں دینے کے لئے جرمنی جانا چاہتے ہو ۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا ۔ اس نے کہا کہ وہ گاؤں کا آخری آدمی نہیں ہونا چاہتا، جسے یورپ جانا نصیب نہ ہو اور جس کی زندگی کولہو کے بیل کی طرح گاؤں اور مدرسہ کا چکر لگاتے لگاتے گذر جائے ۔ اس زمانے میں چونکہ انگلستان میں داخلہ پر پابندیاں لگ چکی تھیں، اس لئے وہ جرمنی جانا چاہتا تھا ۔

میں جرمنی واپس لوٹا، تو اقوام متحدہ کی ایک ذیلی آرگنائزیشن کی طرف سے میری مصر میں تقرری کا پروانہ آیا ہوا تھا اور یہ ہدایت کی گئی تھی کہ جلد از جلد قاہرہ جا کر چارج لے لوں ۔ میں نے ماسٹر قربان کو اس نئی صورت حال کی اطلاع دی اور لکھا کہ وہ جرمنی آنے کا پروگرام میری مصر سے واپسی تک ملتوی کر دے ۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر ضروری انتظامات کرنے کے بعد مصر چلا جاؤں ۔ میری روانگی سے عین ایک ہفتہ قبل ماسٹر قربان کا ٹیلیگرام آگیا، جس میں اس کی ہمبرگ میں آمد کا وقت اور فلائیٹ نمبر درج تھا ۔ اب صرف ایک دن کے اندر اندر مجھے اس کی

رہائش کا انتظام کرنا تھا اور کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا، جو میری نیابت میں ماسٹر قربان کو رہائش کا پرمٹ دلا سکے اور کام کا بندوبست کرے۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنی سیکرٹری سے کیا، جو ایک پادری کی بیوی تھی اور جس کے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ وہ غیر ملکیوں کی امداد و معاونت کرنے میں بہت مستعد تھا۔ سیکرٹری نے کہا کہ اس کے خاوند کے چرچ کے ساتھ، جہاں پر ان کی اپنی رہائش بھی ہے، ایک بلڈنگ میں کمرہ خالی ہے، جس میں ماسٹر قربان کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ان کے تعلقات فارن پولیس کے محکمہ کے ساتھ اچھے تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ اسے رہائش اور کام کا پرمٹ لے کر دے سکیں گے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اسی ہفتے مصر کے لئے روانہ ہو گیا، جہاں پر میری زندگی اس درجہ مصروف تھی کہ خط و کتابت کے لئے بھی وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس طرح میرا رابطہ ماسٹر قربان کے ساتھ قائم نہ رہ سکا اور مجھے بالکل پتہ نہ چل سکا کہ اس کی زندگی جرمنی میں کیسے بسر ہو رہی تھی۔

نصف سال کے بعد جب میں مصر میں اپنے قیام کے خاتمے پر جرمنی واپس آیا تو اس وقت تک ماسٹر قربان بدستور پادری کی فیملی کے ہاں مقیم تھا۔ اس کو کام مل گیا تھا اور اس نے ایک گرل فرینڈ بھی بنا لی تھی۔ میری سیکرٹری نے بتایا کہ وہ اس کی سترہ سالہ بیٹی تھی۔ انہیں دونوں کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر وہ شادی کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ چونکہ دونوں کی عمروں میں بہت تفاوت تھا، اس لئے اسے خطرہ تھا کہ یہ رشتہ پائیدار ثابت نہ ہو گا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ماسٹر قربان سے اس سلسلہ میں بات کروں۔ جب میں نے اس سے بات کرنی چاہی، تو وہ صاف انکار کر گیا کہ اس کا لڑکی کے ساتھ کوئی واسطہ ہے۔ اس نے کہا کہ دراصل ماں باپ اپنی پاگل سی لڑکی کو اس کے سر منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ پھر مجھے پتہ ہے کہ پیچھے گاؤں میں اس کی بیوی موجود ہے۔

چند ہفتوں کے بعد میری سیکرٹری نے بتایا کہ اس کی بیٹی حمل سے ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے ماسٹر قربان سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ جرمنی میں تعدد ازدواج قانوناً منع ہے۔ اس وجہ سے ایک سرٹیفیکیٹ کا پیش کرنا لازمی ہے

کہ شادی کا طالب پہلے سے متزوج نہیں ہے، یا اگر پہلے شادی شدہ تھا، تو اس دوران میں طلاق ہو چکی ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ ماسٹر قربان نے مطلوبہ سرٹیفکیٹ کیسے حاصل کیا تھا، جعلی بنوایا تھا یا کسی طریق سے رشوت دے کر نکلوایا تھا۔ بہر صورت ان کی شادی ہو گئی، جس میں مجھے شامل ہونے کی دعوت نہ دی گئی۔ غالباً ماسٹر قربان مجھ سے شرمندہ تھا۔ اور پھر اسے خطرہ ہو گا کہ میں کہیں اس کا راز فاش نہ کر دوں۔ اس کے بعد ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا اور مجھے آئندہ سالوں میں کوئی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں پر ہوتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

قبرستان سے نکل کر ہم رتے کنویں کا پانی پینے کے بعد گاؤں کی گلی میں داخل ہوئے، جہاں پر پہلی حویلی ماسٹر قربان کی پڑتی ہے۔ عین اس وقت اس کی بیوی پریشانی کے عالم میں ننگے سر دروازے سے باہر نکل آئی۔ اس نے ایک ٹیلیگرام ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور اسے کسی انگریزی دان سے پڑھوانا چاہتی تھی۔ مگر جس کسی کو اس نے ٹیلیگرام دکھایا تھا، وہ عبارت کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عبارت جرمن زبان میں تھی۔ میں اسے پڑھ کر بھونچکا رہ گیا، کیونکہ اس میں ماسٹر قربان کے اچانک وفات پا جانے کی خبر تھی اور لکھا تھا کہ مارتھا خود اس کا جنازہ لے کر اگلے روز گاؤں میں پہنچ رہی تھی۔ یہ سنتے ہی ماسٹر قربان کی بیوی چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گئی اور سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

اس اچانک خبر کے سبب میرے گاؤں میں آنے کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ سارے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو ماسٹر قربان کی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ ہر کوئی مجھے خوش آمدید کے دو بول کہنے کے بعد جلد از جلد رخصت چاہتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری گاؤں میں آمد ایک منحوس لمحے میں ہوئی تھی اور یہ کہ میں نہ آتا، تو شاید ماسٹر قربان نہ مرتا اور گاؤں کا امن وامان اس طرح نہ ٹوٹتا۔ مگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے، تو میری وجہ سے ماسٹر قربان کی بیوی مبارکہ کو بیٹھے بٹھائے جرمن زبان کا مترجم مل گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مارتھا کو، جو نعش کو لا رہی تھی، انگریزی نہ آتی تھی۔ اور گاؤں میں میرے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا، جو اس سے جرمن زبان میں گفتگو کر سکتا۔

میرا قیاس درست نکلا۔ مارتھا کو صرف جرمن زبان آتی تھی۔اس نے اگر جرمن ائر لائنز لفت ہانزا میں سفر نہ کیا ہوتا، تو اسے شاید گاؤں تک پہنچنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مبارکہ نے بتایا کہ مارتھا ستر اسی برس کی بڑھیا اور ماسٹر قربان کی لینڈ لیڈی ہے۔ مبارکہ نے اس کی بہت تعریفیں کیں، کیونکہ وہ اس کا اور اس کے بچوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب بھی ماسٹر قربان سال دو سال کے بعد وطن آتا تھا، تو وہ اس کے ہاتھ تحفے تحائف اور بچوں کے لئے کپڑے اور کھلونے بھیجا کرتی تھی۔ بلکہ وہی ماہوار اس کو منی آرڈر بھیجتی تھی۔ مبارکہ نے کہا کہ ایسی نیک عورت شاید سارے جرمنی میں اور کوئی نہ ہوگی۔ اب اس بات کو دیکھ لیں کہ وہ ماسٹر قربان کا جنازہ لے کر خود آرہی ہے، جب کہ اس عمر کی عورتیں ہمارے ملک میں تو چلنے پھرنے سے لاچار ہو جاتی ہیں۔

جنازہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مارتھا پینتیس چالیس برس کی عورت تھی، جو غالباً میری سابقہ سیکرٹری کی بیٹی اور ماسٹر قربان کی منکوحہ بیوی تھی۔ وہ مبارکہ سے گلے لگ کر بے حد روئی اور اس نے مجھے کہا کہ صرف مبارکہ اس کے غم کو پوری طرح سمجھ سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ماسٹر قربان کی بہن ہے، جسے اس کا مرحوم خاوند بہت عزیز رکھتا تھا۔ اور ساری عمر اس نے نوجوانی میں بیوہ ہو جانے والی بہن اور اس کے یتیم بچوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے رکھا تھا۔ وہ ان کی ایک ایک خواہش پوری کرتا تھا اور سال دو سال کے بعد ضرور گاؤں کا چکر لگاتا تھا تاکہ دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔

سارا گاؤں جنازے میں شریک ہوا۔ مولوی سعید سب سے آگے آگے تھا۔ پتہ چلا کہ وہی قبرستان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے یورپ میں وفات پا جانے والوں کی لاشوں کو گاؤں میں لانے کی ایجنسی بھی کھول رکھی تھی اور وہی قبروں کو پختہ کراتا اور ان پر سنگ مرمر کے کتبے لگواتا تھا۔ اس نے ایک مالی ملازم رکھا ہوا تھا جو پودوں کو لگاتا اور انہیں پانی دیتا تھا۔ فرمائش پر قبروں پر حجرے اور باقاعدہ مقبرے بنانے کا انتظام بھی موجود تھا۔ برتھ ڈے یا دوسرے تہواروں پر قبروں کو پھولوں سے سجانے اور ان کو معطر پانی سے غسل دینے کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ ایک

حافظ قرآن کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں ، جو خاص خاص تہواروں پر قبروں پر تلاوت قرآن کرتا تھا۔

مارتھا ہفتہ بھر گاؤں میں رہی اور میں بطور مترجم سارا وقت اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اسے اس بات پر کسی قدر حیرت ضرور تھی کہ ماسٹر قربان کی بہن مبارکہ، جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے سال ایک بچہ جنتی رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمارے رسوم و رواج کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی اور نہ ہی اپنے عیسائی اخلاقی اقدار کو ہم پر ٹھونسنا چاہتی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں بیوہ عورتوں کو اپنے خاوندوں کے مر جانے کے بعد بچے جننے کی عام اجازت ہو۔ دوسری طرف مبارکہ کو جرمن عورتوں کی صحت مندی پر رشک آرہا تھا، جو ستر اسی برس کی عمر میں بالکل جوان لگتی ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر اسے ماسٹر قربان نے نہ بتایا ہوتا کہ اس کی لینڈ لیڈی مارتھا اس قدر عمر رسیدہ عورت ہے، تو وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوتی کہ مارتھا کسی طریق سے بھی چالیس برس سے بڑی عمر کی ہے۔

(کمر فیلڈ (جرمنی) ۔ ۸ جون ۱۹۹۲ء)

پل صراط

یہ احساس نہ جانے کیوں میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا کہ وہ میرے تعاقب میں ہے۔ جرمنی سے اتنی دور اسپین میں مجھے کون جانتا تھا۔ اور انہیں بھلا کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ میں اسپین چلا گیا تھا۔ پھر اسپین اتنا بڑا ملک ہے کہ وہاں پر مجھے تلاش کرنا گھاس کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوتا۔ پولیس نے مجھے نیا نام دے دیا تھا اور اس نام پر شناختی کارڈ اور پاسپورٹ جاری کیے گئے تھے، جن پر میری تاریخ پیدائش بلکہ جائے پیدائش تک کو بدل دیا گیا تھا۔ رہائش گاہ کا پتہ بھی دوسرا تھا۔ پھر میں نے ہوائی جہاز بھی ایک اور شہر سے جا کر پکڑا تھا۔ میں نے کسی کے سامنے سفر پر جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اپنے کسی خط میں بھی اس طرف کوئی اشارہ نہ کیا تھا۔ ٹیلی فون کا استعمال ہم نے بہت دنوں سے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ متعلقہ محکمہ نے ہمارا ٹیلی فون نمبر بدل دیا تھا اور نئے نمبر کے بارے میں ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ اسے کسی کو نہ دیں۔ بلکہ خود بھی اس نمبر کو بھول جائیں۔ اسے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں درج نہیں کیا جائے گا اور اس کے بارے میں ٹیلی فون انکوائری کسی کو کوئی معلومات نہیں دے گی۔ اس دن سے ہم نے آنے والی فون کالوں کو ریسیو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور فون کا استعمال صرف اس صورت میں کرتے تھے، جب ہم خود کسی سے بات کرنا چاہتے تھے۔

اس روز میں اکیلا شہر میں گھومنے پھرنے کیلئے چلا گیا تھا۔ بندرگاہ سے ہوتا ہوا بڑی سڑک کی طرف نکل گیا تھا اور ایک کیفے میں جا کر بیٹھا تھا، جہاں پر عام رواج کے برخلاف موسیقی نہیں بج رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے لئے بیٹھنے

کی جگہ کا انتخاب کرتے ہوئے یہ نہ دیکھا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر عین میرے سر کے اوپر نصب تھا۔ اس غلطی کا احساس مجھے اسوقت ہوا تھا، جب کسی نے موسیقی کا کیسٹ لگا دیا تھا، جسکی آواز اسقدر بلند تھی کہ یوں لگا جیسے میرے سر پر ہتھوڑے پڑنے لگے ہیں۔ مجھے ریستوران میں آئے ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہوئے تھے اور بیرے نے کافی کی پیالی ابھی لاکر میرے سامنے رکھی ہی تھی۔ میں نے اسوقت تک شاید صرف دو یا تین چسکیاں لی تھیں۔ پیالی ابھی لبالب بھری ہوئی تھی۔ پھر میں نے اچانک اٹھ کر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ بلکہ بیرے کے آنے کا انتظار کئے بغیر کاؤنٹر پر جاکر بل ادا کیا اور کیفے سے باہر نکل گیا۔ عین اس وقت وہ شخص بھی اپنی سیٹ پر سے اٹھا اور کاؤنٹر پر پیسے پھینک کر میرے پیچھے چلنے لگا۔

مجھے اس پر حیرت تو ضرور ہوئی، مگر میں نے اسے اتفاق قرار دیا اور سڑک کے کنارے کنارے ٹہلتا ہوا جیولری کی ایک دوکان کے سامنے رک کر شو کیس کو دیکھنے لگا۔ البتہ میری توجہ اس آدمی کی طرف لگی ہوئی تھی، جو ریستوران سے نکلنے کے بعد سے میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس کی طرف رخ موڑے بغیر میں نے کن اکھیوں سے دیکھ لیا کہ وہ بھی ایک دوکان کے سامنے رک گیا تھا۔ مجھے شو کیس میں لگا ہوا موتیوں کا ایک ہار پسند آگیا اور میں اسکی قیمت پوچھنے اور ہار کی کوالٹی کو پرکھنے کی نیت سے دوکان میں چلا گیا۔ مگر میری توجہ بدستور باہر کیطرف لگی ہوئی تھی۔ اور اسوقت بھی جبکہ ہار کو شو کیس میں سے نکالا جا رہا تھا اور پھر جب میں اسے قدرتی روشنی میں دیکھنے کیلئے کھڑکی کے سامنے جاکر کھڑا ہوا تھا، دراصل میری نظریں اس آدمی کو تلاش کر رہی تھیں، جسکے بارہ میں میرا شبہ تقویت پکڑتا جارہا تھا کہ وہ میرے تعاقب میں ہے۔ میں اسے قریب سے دیکھنا اور اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسکا راز جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ بزدل سامنے نہ آیا۔ اس دوران میں ہار کا سودا ہو گیا۔ جرمنی میں ایسے ہار کیلئے مجھے یقیناً تین چار گنا زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی۔ چیک لکھتے لکھتے میرا قلم رک گیا، کیونکہ مجھے یاد آگیا کہ یورو کریڈٹ کارڈ ابھی تک میرے پرانے نام پر ہے۔ ہمیں جرمنی کو ایسی افراتفری میں چھوڑنا پڑا تھا کہ بنک اکاؤنٹ کو نئے نام پر منتقل کرانے کا وقت نہ مل سکا تھا۔ اب اگر میں پرانے نام پر چیک کاٹ دیتا، تو اول

تو اس نام کا شناختی کارڈ میرے پاس نہیں تھا، جسے دوکاندار شاید دیکھنا چاہتا۔ اور اگر ہوتا بھی تو مجھے اس نام کو استعمال نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ اسطرح آسانی کیساتھ میرا راز کھل سکتا تھا۔ میں نے دوکاندار سے معذرت چاہی اور کہا کہ میں کریڈیٹ کارڈ گھر پر بھول آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ ہار کو میرے لئے ریزرو کر دیگا۔ میں نے اگلے روز پھر آنے کا وعدہ کیا اور دوکان سے باہر نکل گیا۔

دوکان میں آدھ گھنٹہ تو ضرور لگ گیا ہوگا۔ سڑک پر قدم دھرنے سے پہلے میں نے دائیں بائیں نظر ڈالی۔ وہ آدمی دور و نزدیک کہیں پر دکھائی نہ دیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں اپنے آپکو ملامت کرتے ہوئے کہ خواہ مخواہ آدمی پر شبہ کر لیا تھا آگے کو چل دیا۔ کافی پینے کی خواہش بدستور میرے دل میں مچل رہی تھی۔ اسلیئے میں پہلے کافی ہاؤس میں داخل ہو گیا، جو میرے راستے میں پڑتا تھا۔ سڑک کیطرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس ایک میز خالی تھی۔ میں وہاں پر جا کر بیٹھا اور باہر کیطرف جھانکنے لگا۔ عین اسوقت میری نظر اس آدمی پر پڑی، جو سڑک عبور کر کے اسی کافی ہاؤس کیطرف بڑھ رہا تھا، جسمیں میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کافی دور ایک میز پر جگہ لی، مگر مجھے یہ احساس تھا کہ وہ کن اکھیوں سے میری طرف تک رہا تھا کیا میرا شبہ درست تھا کہ وہ میرے تعاقب میں ہے؟

میرے خیالات کا سلسلہ اسوقت ٹوٹا، جب ایک لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے میری میز کی دوسری کرسی پر بیٹھنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ میں نے کرسی کے خالی ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے اسے اس پر بیٹھنے کو کہا۔ مگر میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنی ساری خالی میزوں کو چھوڑ کر میرے پاس آکر بیٹھنے میں کیا راز تھا۔ جرمنی میں لوگ عام طور سے ایک دوسرے سے ہٹ کر بیٹھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید اسپین میں اسکے الٹ وہاں پر بیٹھنے کا رواج ہو، جہاں پر دوسرے لوگ بیٹھے ہوں۔

"تم جرمنی میں رہتے ہو؟" لڑکی نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے اس نے مجھے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ مگر میں اتنی آسانی کے ساتھ ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

"یہ نتیجہ تم نے کیسے نکالا۔ یقیناً میری شکل و شباہت سے کوئی شخص یہ قیاس نہیں لگا سکتا"۔ میں نے جواب دینے کی بجائے خود سوال کر ڈالا۔

"سوال کرنے تک یہ محض ایک قیاس تھا۔ مگر تمہارا جواب سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا قیاس درست تھا"۔ لڑکی اپنی فتح پر مسکرا رہی تھی، جبکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بھی میرے تعاقب میں تھی۔ شاید وہ اس آدمی کی ساتھی تھی۔

میں نے بے خیالی میں اس طرف دھیان نہ دیا تھا کہ ہماری گفتگو جرمن زبان میں ہو رہی تھی۔ اس زبان کی بجائے اب انگریزی میں بات کرنا مجھے مضحکہ خیز لگا۔ مجھے اپنی ہار کو ماننے کے لئے دانتوں کی نمائش کرنی پڑی۔

"تم نے شاید نوٹ نہیں کیا کہ میں تمہارے بنگلہ کے پہلو میں رہائش پذیر ہوں۔ پہلے روز جب تم آئے تھے، تو میں نے تمہیں ٹیکسی میں سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے اگلے روز جب تم اپنی بیوی کے ساتھ باہر جانے کے لئے نکلے، تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ تم نے راتوں رات اپنی داڑھی کا صفایا کر دیا تھا۔ اس سے مجھے خیال آیا تھا کہ تم شاید سلمان رشدی ہو اور یہاں پر چھپنے کی غرض سے آئے ہو۔ اگر تم نے آتے ہی داڑھی نہ مونڈھ ڈالی ہوتی، تو شاید یہ شبہ پیدا نہ ہوتا" لڑکی کی منطق قابل داد تھی۔

"داڑھی کا کیا ہے۔ دو چار روز تک شیو نہ کروں، تو پھر نکل آئے گی"۔ میں نے اس کی بات کو ٹالنے کے لئے کہا۔

"وہ بات دوسری ہے۔ مگر جب کوئی شخص اپنی شکل و صورت کو بدلنے کی خاطر اچھی بھلی داڑھی کو قربان کر دیتا ہے، تو اسکے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم وجہ ہوتی ہے' میرا ماتھا تو اسیوقت ٹھنکا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے"۔

"میں عام طور سے ہر روز شیو کرتا ہوں اور جس صورت میں تم مجھے دیکھ رہی ہو، یہی میری روزمرہ کی شکل وصورت ہے۔ داڑھی میں نے یونہی رکھ لی تھی۔ نہیں، اب تم سے کیا چھپانا ہے، دراصل میرے گالوں پر خارش کی پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ ڈاکٹری مشورہ سے میں نے دو ہفتوں تک شیو نہ کی تھی۔ بلکہ اسی وجہ سے مجھے ساحل سمندر پر جا کر چند ہفتے گذارنے کو کہا گیا تھا۔ تم دیکھ سکتی ہوں کہ

پھنسیاں غائب ہو گئی ہیں "۔

میں نے محسوس کیا کہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے مشکل پڑ رہی تھی ۔ میرے داڑھی بڑھانے کا باعث دراصل وہ دھمکیاں تھیں، جو مجھے کئی ہفتوں سے ٹیلی فون پر مل رہی تھیں ۔ پہلی بار فون کی گھنٹی رات کے دو بجے بجی تھی اور میں چونکہ نیند سے ہڑبڑا کے اٹھا تھا اور میرے ہوش و حواس ابھی پوری طرح ٹھکانے پر نہ تھے، اس لئے میں کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے ۔ کوئی شخص شاید مجھے گالیاں دے رہا تھا ۔ کیا وہ اردو بول رہا تھا یا پنجابی؟ اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، اس نے فون کی لائن کو بند کر دیا تھا ۔ میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی ۔ بلکہ آئندہ دنوں میں جب دو تین بار اسی قسم کے فون آئے، تب بھی میں نے کسی کے ساتھ اس کا ذکر نہ کیا ۔ البتہ میں اس دوران میں یہ جان گیا کہ فون کرنے والا اگرچہ اردو بولتا تھا اور اسی زبان میں مغلظات بکتا تھا، مگر اس کی مادری زبان پنجابی تھی ۔ شاید اسے پتہ نہ تھا کہ بعض گالیاں، جو اس کا تکیہ کلام تھیں، اردو میں اس طرح نہیں دی جاتیں، جیسے پنجابی زبان میں ۔

پھر ایک اتوار کو سہ پہر کے وقت اسکا فون آیا ۔ میں نے آواز کو پہچان لیا ۔ مگر اب کے اس نے کوئی گالی نہ دی ۔ اس نے کہا کہ وہ اتفاق سے پنے برگ نامی شہر میں آیا ہوا ہے، جو ہمارے گاؤں کے قریب واقع ہے ۔ وہاں پر اسکے دوست رہتے ہیں انہی کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ میں وہاں پر کہیں قرب و جوار میں رہتا ہوں ۔ اس نے میرے بارہ میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور کئی بار مجھے ٹیلی ویژن پر دیکھا اور ریڈیو پر سنا تھا ۔ اس وجہ سے اسے مجھ سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا ۔ اگر مجھے اعتراض نہ ہو، تو وہ مجھے گھڑی کی گھڑی ملنے کیلئے آنا چاہتا ہے ۔ اس مقصد کیلئے اس نے مجھ سے میرے گھر کا راستہ جاننا چاہا ۔ اس بات سے کم از کم یہ پتہ چل گیا کہ اسکے پاس میرے گھر کا پتہ نہیں تھا ۔ جرمنی میں ٹیلی فون ڈائریکٹری میں عام طور سے مکمل پتہ درج ہوتا ہے ۔ مگر چھوٹے موٹے گاؤں کے فون نمبروں کے ساتھ پتہ لکھنے کا رواج نہیں ہے ۔ میں نے اسے ٹال دیا ۔ یوں بھی ہمارے ہاں اسوقت جرمن ادیب یواخیم زائیل آیا ہوا تھا ۔ میں نے یواخیم کو بتایا کہ جو شخص ٹیلی فون پر مجھ سے ملنے کی

خواہش کا اظہار کر رہا تھا، وہ مجھے کئی بار فون پر گالیاں دے چکا ہے۔ مگر مجھے بالکل علم نہیں ہے کہ میں نے اسکا کیا بگاڑا ہے۔ یواخیم نے کہا کہ شاید تم نے ریڈیو پر یا ٹیلی ویژن کی ٹاک شو میں کوئی بات کہہ دی ہو گی، جو اس شخص کو ناگوار گذری ہو گی۔ یواخیم نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ اس معاملے میں کسی تنظیم یا گروہ کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اسے بھی اپنی زندگی میں آزادی رائے اور اسکے اظہار کے حق پر زور دینے کے سبب بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک زمانہ میں اسے مغربی جرمنی کو خیر باد کہہ کر مشرقی جرمنی میں جا کر رہائش اختیار کرنی پڑی تھی۔ پھر وہاں پر ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مشرقی جرمنی کے ادیبوں کی تنظیم نے اسکی رکنیت کو منسوخ کر دیا اور اس ملک کی حکومت نے اس سے شہریت کا حق واپس لے لیا۔ یواخیم نے کہا کہ یہ بھی خیریت گذری کہ اسے ملک سے باہر چلے جانے کی اجازت دے دی گئی، وگرنہ وہ اسے جیل میں ڈال دیتے، جیسا کہ بے شمار دوسرے ادیبوں کے ساتھ ہو چکا ہے، تو وہ اسکے خلاف کیا کر سکتا تھا۔

اگلی بار اسکا فون آیا، تو سیدھا سیدھا قتل کر دینے کی دھمکی لیکر آیا۔ اس سے ایک روز قبل بروسلز کی مسجد کے امام کو کسی نے گولی مار کر مار ڈالا تھا۔ اسلئے اوتا نے کہا کہ اب ہمیں معاملہ پولیس کے پاس لے جانا چاہیئے۔ پولیس کا حفاظتی دستہ اطلاع ملنے پر پندرہ منٹوں کے اندر اندر ہمارے مکان پر پہنچ گیا۔ جلد بعد انکا خاص عملہ آگیا۔ ہمارے بیانات کو نوٹ کیا گیا اور دیگر ضروری معاملات کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہمیں کہا گیا کہ اس رات کسی دوسری جگہ پر جا کر سوئیں۔ پولیس نے ہمارے مکان کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی اور ہمیں اپنی حفاظت میں ایک دوسرے مکان پر پہنچا دیا۔ دوسرے روز حکومت کے ماہرین حالات کا جائزہ لینے کیلئے آ گئے۔ انہیں کے مشورہ پر ہم نے چند دنوں کیلئے جنوبی جرمنی چلے جانے کا پروگرام بنایا، جسکے دوران میرے لئے نیا شناختی کارڈ بنایا گیا اور نئے نام پر پاسپورٹ تیار ہوا، تاکہ ہم اسپین جا کر اس قضیئے پر گھاس اگ جانے کا انتظار کر سکیں۔

اسپین کے اس ساحلی مقام پر ہم شام کے وقت پہنچے تھے۔ ہمارا بنگلہ شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ مگر مجھے بالکل یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس لڑکی کو وہاں پر

دیکھا تھا، جو کافی ہاؤس میں میرے مدمقابل بیٹھی ہوئی تھی۔اس علاقہ کے اکثر بنگلے بند پڑے تھے، کیونکہ ابھی گرما کا سیزن شروع نہ ہوا تھا۔لڑکی خاصی خوبصورت اور فیشن ایبل تھی۔اس نے بتایا کہ وہ ایک تعمیراتی فرم میں ملازم ہے اور بنگلے فروخت کرنے کے سلسلہ میں سال کا بیشتر حصہ وہاں پر گذارتی ہے۔اس وجہ سے وہ غیر ملکی تورسٹوں کو یہ جاننے کیلئے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتی ہے کہ کیا انہیں وہاں پر بنگلہ خریدنے میں دلچسپی ہوگی یا نہیں۔ہمیں بھی اس نے اسی وجہ سے شام کے وقت ٹیکسی سے اترتے ہوئے اپنی ماہرانہ نظروں سے جانچا تھا۔اسے میری بڑھی ہوئی داڑھی کو دیکھ کر شاید مایوسی ہوئی ہوگی۔پھر جب میں اگلی صبح داڑھی مونڈھ کر باہر نکلا، تو اس نے ہمیں بنگلہ کی خریداری کی پیش کش کرنے کا تہیہ کرلیا۔

"تو گویا تم مجھے خریدار بنانے کے لئے میرے پاس آکر بیٹھی ہو؟"

"تم جانتے ہو کہ بزنس مین تو ہر وقت موقعہ کی تلاش میں رہتا ہے۔گاہک اور موت سے انسان کی کسی وقت بھی مٹھ بھیڑ ہوسکتی ہے"۔

میں نے اسے بہتیرا کہا کہ ہمیں بنگلہ خریدنے میں دلچسپی نہیں، مگر اس کا اصرار تھا کہ پراسپکٹس پر ایک نظر ڈالنے میں بھلا کیا حرج ہے۔وہ اپنی کار سے پراسپکٹس لانے کے لئے اٹھی اور جاتے ہوئے جرمن اخبار "بلڈ" مجھے پڑھنے کیلئے دے گئی، جسے اس نے اپنے بیان کے مطابق کافی ہاؤس میں آتے ہوئے راستے میں خریدا تھا اور ابھی کھول کر دیکھا بھی نہ تھا۔اخبار میں نمایاں طور پر ایک خبر میرے بارے میں چھپی ہوئی تھی، جس میں بیان کیا گیا تھا کہ مجھے قتل کی دھکیوں کے سبب روپوش ہونا پڑا تھا اور یہ کہ دھمکیوں کے پیچھے، جو ٹیلی فون پر دی گئی تھیں، پولیس مذہبی دہشت گردوں کا ہاتھ سمجھتی تھی۔تو گویا بات نکل گئی تھی، باوجود اس کے کہ میں نے اسے اپنے دوستوں تک سے پوشیدہ رکھا تھا۔اپنے واقف کار اخبار نویسوں کے ساتھ بھی میں نے اس کا ذکر نہ کیا تھا، کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اسے بڑھا چڑھا کر اخبار میں چھاپ دیں گے اور میرے لئے کہیں پر سر چھپانا مشکل ہو جائے گا۔خوش قسمتی سے اخبار میں میری تصویر نہ چھاپی گئی تھی اور لڑکی کو میں نے نہیں بتایا تھا کہ میں جرمنی کے کس شہر میں رہتا ہوں۔اس وجہ سے مجھے امید تھی کہ وہ قیاس نہ لگاسکے گی کہ

اس خبر کا مجھ سے تعلق ہے۔ اگرچہ میرے داڑھی مونڈھنے کے سبب اس کے دل میں میرے بارہ میں شک وشبہ کا بیج پڑ چکا تھا۔

لڑکی واپس لوٹی، تو وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کا واقف کار خوسے مجھے اچھا آدمی نہ لگا، اس لئے مجھے بالکل پسند نہ آیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجھ میں دلچسپی تھی۔ اس نے لڑکی سے ہسپانوی زبان میں کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے تیار کرے۔ باقی کا کام وہ اس پر چھوڑ دے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں علم نہ تھا کہ میں ہسپانوی زبان سمجھتا ہوں۔ بنگلوں کے پراسپکٹوں کی میں نے سرسری طور پر ورق گردانی کی اور کہا کہ مجھے کوئی بنگلہ نہیں خریدنا ہے۔ لڑکی نے جب دیکھا کہ میں کسی طریق سے بنگلہ دیکھنے کے لئے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوتا، تو اس نے مجھے اپنی کار میں واپس گھر پہنچانے کی پیش کش کر دی۔ اس نے کہا کہ وہ میرے پڑوس میں رہتی ہے، اس لئے ہمارا راستہ ایک ہی ہے۔ وہ مجھے بہت خوشی کے ساتھ اپنی کار میں لے جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ میں دوپہر کی گرمی میں چار کلو میٹر پیدل چل کر گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ میں نے کہا کہ مجھے پیدل چلنے میں مزا آتا ہے اور یہ کہ میں ہر روز دو تین بار وہ فاصلہ سمندر کے کنارے کنارے طے کیا کرتا ہوں۔ خوسے نے اسے مزید اصرار کرنے سے روک دیا اور کہا کہ کوئی دوسرا موقعہ نکل آئے گا۔

میں وہاں سے اٹھ کر سڑک پر آگیا اور جیسے میرے قدم خود بخود ساحل سمندر کی بجائے قریبی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف اٹھنے لگے۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ دوپہر کے وقت ساحل پر ویرانی چھا جاتی ہے، کیونکہ سب لوگ کھانا کھانے اور سہ پہر کو آرام کرنے کے لئے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر لوگوں کی اچھی خاصی قطار لگی ہوئی تھی، جو ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں بہت محدود تعداد میں ٹیکسیاں چل رہی تھیں۔ نصف گھنٹہ تک وہاں پر کھڑے رہنے کے بعد میں نے شہر کے اندر سے گذرنے والے ایک راستے سے پیدل گھر جانے کا پروگرام بنا لیا، اول تو وہ راستہ کسی قدر مختصر تھا، دوسرے مکانوں اور اس راستے کے اکا دکا درختوں کا سایہ دھوپ سے تھوڑا بہت بچاؤ کرنے کا سبب بنتا تھا۔ البتہ پرانے شہر اور مضافاتی قصبہ کے درمیان، جہاں پر ہمارا بنگلہ تھا، ایک ایسا علاقہ پڑتا تھا، جہاں پر کارخانے

پائے جاتے تھے، جن کے آس پاس دن دہاڑے لوگوں کو لوٹنے کی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ اس راستے میں ایک مقام ایسا آتا تھا، جہاں پر سڑک ایک پل کو عبور کرتی تھی۔ پل کے نیچے سے نمک کے کارخانے کی کنویر بیلٹ گذرتی تھی، جس پر نمک کو مال برداری کے بحری جہازوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی، جہاں پر حملہ ہونے کی صورت میں انسان نہ آگے جا سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

جب میں پل پر پہنچا، تو دور دور تک کوئی آدمی دکھائی نہ دیتا تھا۔ نمک کے کارخانے کی کنویر بیلٹ بدستور چل رہی تھی۔ پل کے دوسری طرف آبادی تھوڑے فاصلے پر جا کر شروع ہوتی تھی۔ درمیان میں ایک سڑک پڑتی تھی، پھر ایک لمبا چوڑا میدان آتا تھا، جہاں پر تعمیرات کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ ایک عمارت کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اور ایک کئی منزلہ بلڈنگ کا ڈھانچہ بھی کھڑا کر دیا گیا تھا، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ہر منزل پر چار پانچ فلیٹ بنائے جائیں گے۔ ان عمارتوں کو بنانے والی کمپنی کے اشتہاراتی بورڈ لگے ہوئے تھے، جن پر سستے داموں فلیٹوں کی فروخت کا اعلان درج تھا۔ چونکہ ابھی تعمیر کا کام شروع نہ ہوا تھا، یا شاید روکا جا چکا تھا، اس وجہ سے اس علاقے پر ویرانی کا سایہ پھیلا رہتا تھا۔ ایسی جگہیں بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کے لئے مقناطیس کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لئے میں ادھر سے گذرنے سے حتیٰ الامکان گریز کرتا تھا۔ اور اگر کبھی وہاں سے ہو کر جانا پڑتا تھا، تو دائیں بائیں دیکھے بغیر تیزی سے گذر جاتا تھا۔

نمک کے کارخانے کی کنویر بیلٹ ڈیڑھ دو کلو میٹر لمبی تھی۔ وہ سمندر کے کھارے پانی کو سکھانے والے میدانوں سے شروع ہوتی تھی، جہاں پر نمک کے تودے کھڑے تھے۔ مشینوں کے ذریعہ نمک کو اس طرح کنویر بیلٹ پر لادا جاتا تھا کہ ایک مسلسل چلنے والی سفید لکیر کا سماں بندھ جاتا تھا، جو پل کے نیچے سے سرکتی ہوئی بندرگاہ تک جاتی تھی۔ میں جب کبھی وہاں سے گذرتا تھا، تو میرے ذہن کے پردے پر ایک تصویر ابھرتی تھی، جیسے کسی نے فطرت کا پیٹ چاک کر دیا ہو اور اس میں سے نکلنے والی سفید خون کی دھار بہتے بہتے سمندر میں جا کر گرتی ہو۔ میں ابھی انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ پل کے اگلے سرے سے خوسے ابھرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے

گھوم کر پیچھے کی طرف نگاہ ڈالی، تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص، جسے میں نے کافی ہاؤس میں دیکھا تھا اور جس کے بارے میں مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہے، پل کے دوسرے سرے پر کھڑا تھا۔ بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ وہ مجھے اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ جوں جوں وہ قریب آتے گئے، توں توں میرا شبہ تقویت پکڑتا گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ مجھے پکڑ سکتے، میں چھلانگ لگا کر پل کی ریلنگ پر چڑھ گیا اور وہاں سے کنویر بیلٹ پر کود گیا، جو عین اسی مقام پر پل کے نیچے سے گذرتی تھی۔ خو سے اور دوسرے آدمی نے میرے ساتھ کنویر بیلٹ پر چھلانگ لگا دی۔ ہمارے اس پر بیک وقت گرنے سے بیلٹ ٹوٹ گئی اور ہمیں منوں ٹنک سمیت گہرائی میں لے چلی۔ گہرائی بھی ایسی اتھاہ کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔

میری چیخ نکل گئی اور آنکھ کھلنے پر میں نے دیکھا کہ اوتا مجھ پر جھکی ہوئی پوچھ رہی تھی کہ کیا میں نے کوئی ڈراونا خواب دیکھا تھا۔ میرا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا اور مجھے یقین تھا کہ مجھے وہ واقعہ خواب میں نہیں، بلکہ حقیقت میں پیش آیا تھا۔ اوتا نے سرہانے پر قے کا دھبہ دیکھا، جو بے خبری میں میرے منہ سے نکل گئی تھی اور جس میں خون کی ملاوٹ دکھائی دیتی تھی۔ اوتا کے فون کرنے پر ہسپتال کی ایمبولنس دس منٹوں میں ہمارے گھر پر پہنچ گئی۔ اس کی انچارج ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر تھی، جس نے قے کے دھبے کو دیکھ کر تشخیص کی کہ شاید میرے معدے کا السر پھٹ گیا تھا۔ مجھے اس روز تک پتہ نہ تھا کہ میرے معدے میں السر پایا جاتا ہے۔ آئندہ دو ہفتوں کے دوران، جو مجھے ہسپتال میں گذارنے پڑے، طبی معائنہ سے پتہ چلا کہ السر اپنڈکس کے دہانے پر تھا اور پھٹ جانے کے بعد زخم مندمل ہو رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹروں کو خواب کے بارہ میں کچھ نہ بتایا، کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ خواب اور حقیقت کو آپس میں ملانے والے پل صراط کو سمجھ سکیں گے۔

(کمر فیلڈ (جرمنی) ۔ ۱۹ اگست ۱۹۹۱ء)

کہانخوابی

اگر یہ عنوان آپ کو اوپرا لگتا ہے، تو چنداں باعث حیرت نہیں ہے۔ کیونکہ اردو لغات میں ایسا لفظ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔ دو منٹ پہلے تک میں بھی اسے نہیں جانتا تھا، کیونکہ اس وقت تک میں نے اسے ایجاد نہیں کیا تھا۔ اس کی ضرورت دراصل اس وجہ سے پیش آئی ہے کہ یہ کہانی، جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں، شاید کہانی نہیں ہے، بلکہ ایک خواب ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے یہ خواب کب دیکھا تھا، دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ شاید خواب کو کسی اور نے دیکھا تھا اور مجھے سنایا تھا، پھر میں سمجھنے لگا کہ میں نے اسے خود دیکھا تھا۔ چونکہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے، اس لئے تحقیق کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یقیناً وہ شخص، جس نے مجھے یہ خواب سنایا تھا، اب زندہ نہیں ہے۔ اور اگر وہ بقید حیات ہے، تو بے حد معمر ہو چکا ہو گا اور یہ بات اس کے حافظے سے نکل چکی ہو گی کہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور یہ کہ اس نے وہ خواب مجھے سنایا تھا۔ بلکہ وہ تو مجھے بھی بھول چکا ہو گا۔ اگر آج اتفاقاً میرا اس سے آمنا سامنا ہو جائے، تو وہ مجھے پہچان بھی نہیں پائے گا۔ میں بھی وثوق کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اسے شناخت کر سکوں گا۔ لوگوں کے چہروں کے نقوش اس طرح دنوں کے اندر میرے حافظے کی لوح سے مٹ جاتے ہیں، جیسے کسی نے سلیٹ پر گیلا کپڑا پھیر دیا ہو۔ میں ڈرتا ہوں کہ چند روز تک آئینہ نہ دیکھوں تو خود اپنی شکل و صورت کو بھلا بیٹھوں۔ اس وجہ سے دن میں دو چار بار آئینہ دیکھنا میرے روزمرہ کے معمول میں شامل ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے گا کہ میرا حافظہ عام طور سے کمزور ہے۔ نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میرے حافظے میں ایسی ایسی باتیں

بھی محفوظ ہیں، جن کو میرے سنگی ساتھی عرصہ ہوا فراموش کر چکے ہیں۔ بلکہ مجھے ایسی باتیں بھی یاد ہیں، جن کا وقوع میں آنا شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اب اس خواب کو ہی لے لیجیئے، جو شاید ایک کہانی ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ جس روز باپ چالیس برسوں کی ملازمت سے ریٹائر ہوتا ہے، عین اسی روز بیٹے کو نوکری کا پروانہ ملتا ہے۔ باپ بے حد خوش ہے اور ہر کسی کو بتاتا پھرتا ہے کہ ایسی خوش قسمتی اس کے حصے میں آئی ہے۔ زندگی میں اور کہانی میں تو یوں ہونا چاہیئے کہ بیٹا صبر و شکر کرتے ہوئے نوکری کو قبول کر لے۔ دو چار برسوں میں اس کی شادی ہو جائے۔ اور باپ اپنے مرنے سے پہلے پوتوں اور پوتیوں کر کھلائے، ان کو گود میں لئے لئے پھرے، ان جیسی توتلی زبان بولے اور ایک روز لمبی تان کر سو جائے۔

مگر خوابوں کی طرح فلم ٹوٹ جاتی ہے۔ بیٹا نوکری کی پیش کش پر لات مار کر ایک تعلیمی وظیفہ قبول کر لیتا ہے، اگرچہ کورس اس کی پسند کا نہیں ہے اور تعلیم کے خاتمے پر اسے ایک ایسا کیریئر اختیار کرنا پڑے گا، جس میں اسے ذاتی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر نوکری کے مقابلے میں وہ ہر دوسری زندگی کو، جس کا تعلق کسی نوع سے تعلیم کے ساتھ ہو، ترجیح دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اب زندگی میں اور کہانی میں تو یوں ہونا چاہیئے کہ باپ اپنی قسمت پر روتا دھوتا پنشن لے کر ایک طرف ہو کر بیٹھ جائے۔ مگر خواب میں اس کو ملازمت میں توسیع مل جاتی ہے اور پورے پانچ برسوں تک اس کی نوکری قائم رہتی ہے۔ بیٹا اس عرصے میں تعلیمی مراحل طے کرتا ہے' دریونیورسٹی کی ڈگری لینے کے بعد ایک اسکول میں مدرسی کے لئے درخواست دیتا ہے۔ اور پھر کسی تھرڈ کلاس فلمی کہانی کی طرح اس کی تقرری کا پروانہ آتا ہے، جس میں بیٹے کو عین اس روز ڈیوٹی پر پہنچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، جس روز سے باپ کی پنشن حتمی طور پر شروع ہو رہی ہوتی ہے۔ باپ کو پھر ایک بار اپنی خوش قسمتی والی بات یاد آجاتی ہے اور وہ ہر کسی کو بتاتا پھرتا ہے کہ اس کے بیٹے کی روزی اس روز سے لگ رہی ہے، جس روز اس کی ملازمت کی مدت ختم ہونے والی ہے۔

اب زندگی میں اور کہانی میں تو یوں ہونا چاہیئے کہ بیٹے کو مدرسی راس آ جائے اور وہ اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافے کی خاطر تدریس کی ڈگری حاصل کرے ۔ پھر دو چار دیہاتی مدرسوں میں دھکے کھانے کے بعد کسی چھوٹے موٹے اسکول میں ہیڈ ماسٹر لگ جائے اور اپنی عمر کو اس پیشے کی نذر کر دے ۔

مگر کسی الجھے ہوئے خواب کی طرح بیٹے کا مدرسی کا کیریئر شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے ، کسی آبلے کی طرح جو بلا وجہ ٹوٹ جائے ۔ خوابوں میں زندگی کی طرح ہر چیز ممکن ہے ۔ صرف کہانیوں میں تسلسل کا ہونا اور منطقی نتیجے کا نکلنا ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ کہانی میں بیٹے کو شادی کرنی چاہیئے اس لڑکی کے ساتھ ، جسے ماں باپ نے ایک عمر سے چن رکھا ہے ۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ۔ اس کی شادی اس لڑکی کے ساتھ بھی نہیں ہوتی ، جو اچانک کہیں سے آن ٹپکتی ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے ۔ کسی جھوٹے خواب کی طرح بیٹا پھر ایک بار ایک تعلیمی ادارے میں پہنچ جاتا ہے اور اپنی تعلیم کی تکمیل میں لگ جاتا ہے ۔ باپ اس عرصے میں پنشن لے کر روکھی سوکھی کھا کر اپنی زندگی کے دن گذارتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس کی خوش قسمتی کا ستارہ اب طلوع نہیں ہوگا ۔

پھر کسی دیو مالائی کہانی کی مانند بیٹا اڑ کر جادو کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے ، جہاں پر خوابوں کی طرح سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں ۔ اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ۔ وہ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے ، ادھر پریوں کی ڈاریں اڑتی پھرتی ہیں ۔ اسے لگتا ہے کہ وہ ارضی دنیا کو چھوڑ کر آسمانی جنت میں آن پہنچا ہے ، جہاں پر ہر چیز مختلف ہے اور ہر قانون دوسرا ہے ۔ ارضی دنیا میں پابندیاں تھیں ، چار دیواریاں تھیں اور قیود و حدود کا ایک پورا نظام رائج تھا ۔ اس آسمانی جنت کا باوا آدم نرالا تھا ۔ قانون ثقل تک وہاں پر نہ پایا جاتا تھا ۔ اگر انسان اڑنا چاہتا تھا ، تو پھر سے اڈاری مار کر اڑ جاتا تھا ۔

اب کسی دیو مالائی کہانی کی طرح بیٹے کا سامنا کسی سحر زدہ شہزادی سے ہونا چاہیئے تھا ، جس کو جادو کے زور سے آزاد کرانے پر اس کی شادی دھوم دھام کے ساتھ شہزادی کے ساتھ ہو جائے اور بادشاہ انعام میں اپنی راجدھانی اس کے سپرد کر کے

جنگل میں تپسیا کرنے کے لئے جا بیٹھے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا، بلکہ کسی ڈراونے خواب کی طرح قدم قدم پر اس کا واسطہ پچھل پیریوں کے ساتھ پڑتا ہے، جو اسے جادو چلا کر اپنے زیر اثر لانے پر تلی ہوئی ہوتی ہیں۔

کسی تھرڈ کلاس ناول کی طرح اس عرصے میں اس کا باپ شہر کو چھوڑ کر ایک گاؤں میں جا بستا ہے، جہاں پر اس کو رہائش کے لئے ایک بوسیدہ جھونپڑا میسر آتا ہے، جس کی دیواروں میں دراڑ پڑے ہوئے ہیں اور جس کی چھت چھلنی کر طرح ٹپکتی ہے' بارش میں باہر سے زیادہ پانی کمروں کے اندر ٹپکتا ہے۔ کہانیوں اور زندگی میں اس کا کوئی مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ خوابوں میں فلم کا سین بدلنے میں ذرہ بھر دیر نہیں لگتی۔ بیٹا باپ کو بھول کر اپنا وقت پچھل پیریوں سے بچنے کی سعی میں بسر کرتا ہے۔

پھر کسی بھلا دی جانے والی دیو مالائی کہانی کر طرح اس کی مٹھ بھیڑ ایک سحر زدہ شہزادی سے ہو جاتی ہے، جو اتنی خوبصورت ہوتی ہے، جتنا کوئی جی بھر کے جھوٹ بولے۔ وہ شہزادی کی معیت میں فضاؤں میں اڑتا پھرتا ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر لگتے ہی نہیں۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس سے بڑی محبت اس کی زندگی میں کبھی نہ آئے گی۔ مگر شہزادی کا باپ کسی ہندوستانی فلم کی طرح اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ کہانیوں میں شہزادیاں صرف شہزادوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں، خوابوں کی بات دوسری ہے۔ اس نے سوچا کہ کاش یہ کہانی سچی نہ ہوتی بلکہ محض سپنا ہوتی، جس میں ہر چیز ممکن ہوتی ہے۔ پھر ایک روز اس کی خوابوں کی شہزادی اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتی ہے اور اپنی یاد کے نقش اس کے دل کی گہرائیوں پر چھوڑ جاتی ہے۔ اب اگر یہ کہانی ہوتی، تو وہ مجنوں کی طرح اپنے پنڈے پر راکھ مل کر بیابانوں میں نکل جاتا اور لیلیٰ کا نام جپتا جپتا مر جاتا۔ مگر چونکہ یہ محض ایک خواب تھا، اس لئے سین بدلنے میں ذرہ بھر دیر نہیں لگتی۔

کسی فلمی کہانی کی طرح ایک دوسری شہزادی آن نکلتی ہے اور وہ آناً فاناً پہلی محبت کو بھول جاتا ہے اور نئی شہزادی سے دل لگا لیتا ہے۔ کہانیوں میں شاید یہ بات ممکن نہیں، مگر خوابوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اس نے بھی یہی سوچا تھا کہ وہ محض سہانا سپنا تھا، اس لئے آنکھیں موندے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر کسی سستے

ناول کی طرح اسے شہزادی سے بے انتہا محبت ہو جاتی ہے، جتنی شاید پنوں کو سسی سے بھی نہ ہوئی تھی ۔ اور اسے یقین آجاتا ہے کہ اس محبت کا انجام وہ ہو گا، جو کہانیوں میں نہیں ہوا کرتا۔

پھر کسی تھرڈ کلاس فلم کی طرح وہ اپنے باپ کو، جسے وہ بالکل بھلا چکا تھا، ایک خط لکھتا ہے اور شہزادی کے ساتھ اپنی محبت کا اقرار کرتا ہے ۔ مگر نتیجہ وہ نہیں نکلتا، جو فلموں میں نکلا کرتا ہے، بلکہ خوابوں میں نکل سکتا ہے ۔ باپ اسے فوراً شہزادی سے شادی کرنے کو کہتا ہے، کیونکہ جب تک وہ ایسا نہیں کرتا، باپ اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا ۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں آرام کرنا چاہتی ہیں ۔

کسی فلمی کہانی کی طرح بیٹے کو یقین آجاتا ہے کہ باپ کی نصیحت پر اس کی زندگی میں عمل کرنے کی مہلت بہت تھوڑی رہ گئی ہے ۔ شادی کی خبر ملنے پر باپ اشیرباد بھیجتا ہے، مگر ساتھ ہی کسی سستی فلمی کہانی کی طرح روزگار کے بارے میں پوچھتا ہے ۔

کسی سہانے سپنے کی طرح بیٹے کو ملازمت مل جاتی ہے ۔ بیٹا باپ کو یہ خبر بھیجتا ہے اور اپنی شادی کی تصویریں لفافے میں ڈال دیتا ہے ۔ باپ کو بیٹے کا خط پہنچنے کی خبر ملتی ہے اور وہ اگلے روز رجسٹری کو وصول کرنے کے لئے ڈاک خانے میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے ۔ مگر کسی تھرڈ کلاس فلمی کہانی کی طرح اسی رات دل کا دورہ پڑنے سے مر جاتا ہے ۔ یہ اس سال کی آخری رات تھی ۔ نئے سال کی پہلی تاریخ سے بیٹے کی ملازمت کا آغاز ہونا تھا ۔

حقیقی زندگی میں اور کہانیوں میں اتفاقات اتنے تواتر سے نہیں ہوتے ۔ خوابوں کی بات دوسری ہے ۔

(کمر فیلڈ (جرمنی) ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء)